فیضانِ معرفت

حصہ دوم

افادات

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم
بانی و مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور
وخلیفہ حضرت اقدس مولانا مفتی مظفر حسین صاحب نور اللہ مرقدہ

مرتب
مولوی محمد زبیر قاسمی

فیصل
دیوبند دھلی

فیضانِ معرفت

حصہ دوم

افادات

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی و مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

و خلیفہ حضرت اقدس مولانا مفتی مظفر حسین صاحب نور اللہ مرقدہ

مرتب

مولوی محمد زبیر قاسمی

فیصل
دیوبند دہلی

فیضان معرفت

جلد دوم

افادات

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم
بانی و مہتمم جامعہ جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم
وخلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ
ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

مرتب
محمد زبیر احمد قاسمی
(خادم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم)

ناشر:
اعتقاد پبلشنگ ھاؤس (رجسٹرڈ)

فہرست مضامین

عناوین	صفحہ
دُعائے منظوم	۱۳
مقدمہ	۱۴
دنیا ہمارے لئے اور ہم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں	
دنیا ہمارے لیے اور ہم آخرت کے لیے	۱۶
بھوک شریف - ایک لطیفہ	۱۷
ایک جھوٹے پیر کی قبر کی عبرت ناک حالت	۱۸
ایمان وعمل سے قبر کو بناؤ	۱۹
آخرت کی فکر وتیاری	۲۱
قبر میں فرشتوں کے سوالات	۲۲
رابعہ بصریہؒ کا فرشتوں سے مناظرہ	۲۳
ایک نحوی عالم کا لطیفہ	۲۴
حضرت عثمانؓ کا قبر کے خوف سے رونا	۲۵
افلاطون اور حضرت موسیٰؑ سے ملاقات	۲۶
دنیا کی حقیقت، افلاطون کی نظر میں	۲۷
قوت خیالیہ کی حقیقت	۲۸

قوت خیالیہ اور عاملوں کا دھوکہ	۲۹
قوت خیالیہ کی ایک مثال سے وضاحت	۳۰
آخرت کتنی قریب ہے	۳۲
سلیمان التیمی کا واقعہ	۳۳
اللہ سے ملاقات کا یقین نفس مطمئنہ کی صفت	۳۴
ایک صحابی کا عجیب واقعہ	۳۶
اللہ سے ملاقات کا یقین رکھنے والوں کا حال	۳۷
دنیا مسافر خانہ ہے، ابراھیم بن ادھم کا واقعہ	۳۹
تارک الدنیا بن جاؤ	۴۰
اللہ سے ملاقات کے آداب	۴۱
اللہ کی پسند کیا ہے؟	۴۲
ایک بزرگ کو اللہ سے ملاقات کی خوشی	۴۳
حضرت ابو ہریرہ کو موت کی تمنا	۴۴
کیا موت کی تمنا کرنا جائز ہے؟	۴۵
قبر میں ساتھ کون آئے گا	۴۶
قبر کی آواز	۴۷
تین بھائیوں کا قصہ	۴۸
موت کا مراقبہ ہونا چاہئے	۵۰
عقل مند کی پہچان	۵۱
دنیا جمع کرنے والا بے عقل ہے	۵۲

حساب یسیر کی تفسیر	۵۳
موت کو یاد کرنے کا فائدہ وفضیلت	۵۴
موت کو یاد کرنے والا شہیدوں کے برابر کیوں؟	۵۵
حکیم الامت کا استحضار موت کا طریق	۵۶

حقیقتِ طہارت

حدیث مذکورہ پر ایک اشکال	۵۸
اشکال کا جواب	۵۹
طہارت کی پہلی قسم	۵۹
کتنا سستا سودا ہے!	۶۱
بیڑی سگریٹ سے بچو	۶۲
شریعت انسان بننا سکھاتی ہے	۶۳
مسلمانوں کی پاکی صفائی میں کوتاہی	۶۳
طہارت کی دوسری قسم	۶۵
انگریزوں کی پاکی کا حال	۶۶
گناہ ایک باطنی نجاست	۶۷
گناہ نجس ہے- پہلی دلیل	۶۷
دوسری دلیل	۶۸
تیسری دلیل	۶۹
حدیث کی عجیب منطقیانہ تشریح	۷۰

چوتھی دلیل	۷۱
ظاہری گناہوں سے کیسے بچیں؟	۷۲
پہلی تدبیر-عزم وہمت	۷۳
دوسری تدبیر-توفیق کی دعاء	۷۳
تیسری تدبیر-صحبت کاملین	۷۴
حضرت حکیم الامت کی انوکھی تدبیر اصلاح	۷۴
ایک سالک کا واقعہ	۷۶
طہارت کی تیسری قسم	۷۷
دل کی بیماریاں کیا ہیں؟	۷۷
زنگ آلود دل	۷۸
دل کا زنگ کیسے پاک ہوگا؟	۷۹
حضرت مسیح الامتؒ کی ایک تقریر کا خلاصہ	۷۹
تکبر دل کی سب سے بڑی بیماری	۸۰
بڑائی اللہ ہی کو سزاوار ہے	۸۲
تکبر کا ایک علاج	۸۲
جہنم باطنی بیماریوں کی صفائی کا ہسپتال ہے	۸۴
ایک علمی نکتہ	۸۶
ایمان جنت کا ویزہ ہے	۸۷
جہنم بھی اہل ایمان کے حق میں نعمت ہے	۸۸

ایک آیت کی تفسیر	۸۹
ریا کاری دل کی دوسری بیماری	۹۰
اخلاص کا فقدان دین میں بہت بڑا شگاف ہے	۹۱
دنیا کی محبت دل کی تیسری مہلک بیماری	۹۴
ایک دل میں خدا اور دنیا کی محبت جمع نہیں ہوسکتی	۹۴
دنیا کی محبت کا نشہ شراب کے نشہ سے بڑھا ہوا ہے	۹۵
ایک عبرت خیز حدیث	۹۷
دنیا کا استعمال ضرورت کے لئے ہو	۹۷
دنیا کی مثال	۹۹
دنیا کی حقیقت، اکبرالہ آبادی کا واقعہ	۱۰۰
زمین اپنے خزانے اگل ڈالے گی	۱۰۲
دنیا کی حقیقت پر ایک عجیب قطعہ	۱۰۳
طہارت کی چوتھی قسم	۱۰۴
خواجہ مجذوب کا ایک شعر	۱۰۴
مقصدِ تخلیق معرفت ومحبت حق ہے	۱۰۵
چاروں طہارتیں مل کر آدھا ایمان کیوں ہیں؟	۱۰۶
پہلے تخلیہ پھر تحلیہ	۱۰۷
چوتھا درجہ بطور انعام دیا جاتا ہے	۱۰۸

محبت الٰہیہ اور اس کے آثار ولوازم

اللہ تعالیٰ ہی محبوب حقیقی ہے ۱۱۰
کائنات فانی ہے، ابراہیم کا واقعہ ۱۱۱
فنا سب سے بڑا عیب، سلیمان بن عبد الملک کا واقعہ ۱۱۳
اللہ کی اور غیر اللہ کی محبت کا اجتماع ناممکن-ایک واقعہ ۱۱۵
دعا محبت کی تشریح ۱۱۷
جمال خداوندی ۱۱۹
جنت میں دیدار خداوندی ۱۲۰
کمال خداوندی ۱۲۱
عطاونوال خداوندی ۱۲۳
محبت الٰہیہ کا ثمرہ ایمانی حلاوت ۱۲۵
اطاعت کی لذت-ایک صحابی کا واقعہ ۱۲۶
حضرت عمّارؓ اور شوقِ شہادت ۱۲۷
حلاوتِ ایمانی کی دوسری تفسیر ۱۲۸
ایک صحابی کی اللہ تعالیٰ سے محبت ۱۲۹
حضرت ابراھیم کی اللہ تعالیٰ سے محبت ۱۳۲
محبت کا معاملہ غیرت سے متعلق ہے ۱۳۳
محبت الٰہیہ کے آثار ۱۳۵
پہلی علامت-اطاعت خداوندی ۱۳۵

اللہ کے ولی کو کیسے پہچانیں: ایک واقعہ	۱۳۷
سب سے بڑی کرامت، ایک واقعہ	۱۳۸
محبت ومخالفت جمع نہیں ہو سکتے	۱۳۹
ایک صحابی میں جذبۂ اطاعت	۱۴۰
اطاعت کے دو درجے	۱۴۱
پہلے فرائض ادا کرو اور قضاء کا طریقہ	۱۴۲
دوسری علامت - رضاء بالقضاء	۱۴۳
محبت کو پرکھنے کا معیار	۱۴۴
رضاء بالقضاء کی لذت	۱۴۵
آج کا دعویٔ محبت	۱۴۶
حضرت فاطمہؓ کا صبر وصال نبوی ﷺ پر	۱۴۷
محبت حق پیدا کرنے کا طریقہ - ذکر حق	۱۴۸
ذکر سے مذکور تک	۱۴۹
بعض سالکین کی ایک غلطی پر تنبیہ	۱۵۰
کیا ہمارے پاس ذکر کرنے کے لئے وقت نہیں؟	۱۵۰
دنیا کے مشغلے ذکر میں رکاوٹ بنیں تو کیا کریں؟	۱۵۲
فضول گفتگو سے بچنے کی تدبیر، مولانا میاں صاحب کا واقعہ	۱۵۳
عمر گھٹتی ہے یا بڑھتی ہے؟	۱۵۵
کیا آپ ﷺ ہمیشہ اللہ کا ذکر کرتے تھے - ایک علمی افادہ	۱۵۶
ذکر کرنے کا دوسرا طریقہ	۱۵۷

حصول محبت کا ایک طریقہ-نعمتوں میں غور وفکر ۱۵۹
کتنی محنتوں کے بعد ایک لقمہ تیار ہوتا ہے ۱۶۰
کھانے کا عجیب نظام قدرت ۱۶۱
ناشکری نا سمجھی کا نتیجہ ۱۶۲
انسان بڑا ہی ناشکرا ہے ۱۶۳
ٹھنڈے پانی کی قدر جہنمیوں سے پوچھو ۱۶۴
ٹھنڈے پانی کا شکر بھی ہم سے نہیں ہوسکتا ۱۶۵
ہر مومن کے دل میں اللہ کی محبت ہوتی ہے لیکن ۱۶۵
اصل میں اللہ ہی ہم سے محبت کرتے ہیں ۱۶۷
ایک علمی نکتہ ۱۶۹
ایک شرابی پر اللہ تعالیٰ کی عنایت ۱۷۰

عشق رسولؐ اور اس کے تقاضے

محبت الٰہی کی دو قسمیں ۱۷۲
عشقِ نبوی، اصل ایمان ہے ۱۷۲
حضرت عمرؓ کا واقعہ ۱۷۴
محبت کی تین قسمیں، شرح حدیث ۱۷۵
ایک اور نکتہ ۱۷۶
محبت عقلی وطبعی میں کون افضل ہے؟ ۱۷۶
حضرت عمرؓ کے واقعہ کی شرح ۱۷۷

آپ علیہ السلام سے محبت غالبہ کا مطالبہ	۱۷۹
عشقِ نبویؐ کا ثمرہ	۱۸۰
عشقِ رسولؐ کا بے نظیر نمونہ	۱۸۲
حضرت ثوبانؓ کا عشق	۱۸۳
ایک طالب علمانہ شبہ کا جواب	۱۸۴
اسلام کے بعد صحابہ کی سب سے بڑی خوشی	۱۸۵
آپ علیہ السلام میں تمام اسباب محبوبیت جمع ہیں	۱۸۶
جمال محمدی ﷺ	۱۸۷
حضرت عائشہؓ اور حضرت حسانؓ کے اشعار	۱۸۸
جمالِ نبویؐ پر مزید روایات	۱۸۹
حضرات علماء کے ارشادات	۱۹۰
کمال محمدی ﷺ	۱۹۱
آپؐ کے کمالِ عقلی کا ایک واقعہ	۱۹۱
عطاونوالِ محمدی ﷺ	۱۹۳
عشقِ نبوی کے آثار	۱۹۴
اتباع سنت وشریعت	۱۹۵
معرفت وطریقت کے نام پر دھوکہ	۱۹۶
ذکر نبویؐ	۱۹۶
میلاد کر لینا کافی نہیں	۱۹۷

مشابہت نبوی ﷺ	۱۹۷
حضرت ابن عمرؓ کا کمالِ اطباع	۱۹۸
خلاصہ کلام	۱۹۹

محبت وخشیت کے آنسو

محبتِ الٰہیہ میں رونے کی فضیلت	۲۰۰
ایک بزرگ کا واقعہ	۲۰۱
ایک عاشقِ خدا کا گریہ وبکا	۲۰۲
خوفِ خدا سے رونے کی فضیلت	۲۰۲
ایک عجیب نکتہ	۲۰۳
شاہ عبدالغنیؒ کا واقعہ	۲۰۴
ایک عجیب وحیرت زا واقعہ	۲۰۴
خوفِ خدا سے رونے کے واقعات	۲۰۵
حضرت رسالت مآب ﷺ کی ایک دعا	۲۰۷

اللہ تک پہنچنے دنیا چھوڑنا ضروری نہیں

مردوں کی دو قسمیں، ایک نکتہ	۲۱۰
اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے ہزاروں راستے ہیں	۲۱۱
دینی خدام میں دو چیزوں کی کمی	۲۱۲
نیت کا فتور اور مفتی محمد شفیعؒ کا ارشاد	۲۱۳

ذمہ داری کا احساس نہ ہونا	۲۱۵
تاجر ولی بن سکتا ہے، شیخ منکدر کا واقعہ	۲۱۵
بادشاہ بھی ولی اللہ ہوسکتا ہے، حضرت شجاع کرمانی کا واقعہ	۲۱۷
سب کچھ کریں، مگر دل اللہ سے غافل نہ ہو	۲۲۰
ایک دربان کا مقام ولایت، عبداللہ حاجب کا واقعہ	۲۲۱
یادِ حق اور کاروبار کا اجتماع ممکن - ایک واقعہ	۲۲۳
اُنہیں کا کرم دیکھتے ہیں	۲۲۵

ملنے کا پتہ

مکتبہ مسیح الامت

۸۴ر آرمسٹرانگ روڈ، بیدواڑی، بنگلور

فون: 9242163441

دعاء

از: محمد شعیب اللہ خان ظرؔفی

الٰہی میں تجھ سے دعا مانگتا ہوں ☆ سبھی کے لئے بھلا مانگتا ہوں
گنہ گار ہوں میں سیاہ کار ہوں میں ☆ ترا فضل بے انتہاء مانگتا ہوں
کرم پر جو تیرے بھروسہ ہے مجھکو ☆ خطا کر کے پھر بھی عطاء مانگتا ہوں
تو ناراض ہو گر جیوں گا میں کیونکر ☆ خدایا میں تیری رضاء مانگتا ہوں
بھلا دوں سبھی کو میں خاطر سے اپنے ☆ فقط یک غمِ دلرباء مانگتا ہوں
میں نظروں سے اپنے گرا دوں سبھی کو ☆ میں توفیق ایسی بجا مانگتا ہوں
مجھے یاد تیری میسّر ہو ہر دم ☆ میں ایسی ہی خلوت سرا مانگتا ہوں
میں دنیا سے بیزار ہوں یا الٰہی ☆ بکھیڑوں سے ان سب رہا مانگتا ہوں
خودی اور انا کو مٹانے اے ظرؔفی ☆ خدا سے دوائے فناء مانگتا ہوں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

الحمد لأ هله و الصلوة لأهلها:

اللہ تعالی نے حضرت والا کی مجالس کے مجموعہ ’’فیضان معرفت‘‘ کی جلد اول کو بے پناہ مقبولیت عطاء فرمائی، قلیل مدت میں پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا، جلد اول شائع ہو کر تقریباً دوسال کا عرصہ ہوگیا تھا، بہت سارے لوگ دوسری جلد کے منتظر تھے، لیکن درمیان میں حضرت والا کے تصنیف کردہ رسالوں کے مجموعہ ’’جواہر شریعت‘‘ کی ترتیب میں مصروف ہونے کی وجہ سے دوسری جلد کے آنے میں تاخیر ہوگئی۔

اب اللہ تعالی نے جلد دوم کو ترتیب دینے کی سعادت نصیب فرمائی، جلد اول کے مقابلہ میں جلد دوم کی ترتیب کچھ بدل دی گئی ہے، جلد اول میں ایک ہی جگہ ایک مجلس کی تمام باتوں کو ایک موضوع کے تحت جمع نہیں کیا گیا تھا، بلکہ مجالس میں ہونے والی مختلف باتوں کو مختلف عناوین کے تحت منتشر طور پر جمع کیا گیا تھا، لیکن حضرت والا کے مشورہ سے اس جلد میں مجلس وار ایک موضوع سے متعلق تمام بیانات کو یکجا کردیا گیا ہے، نیز اس جلد میں حضرت والا کے تحریر کردہ بعض اہم اصلاحی مضامین کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ مثلاً ’’محبت الٰہیہ‘‘ ’’محبت وخشیت کے آنسوں‘‘ وغیرہ

ان مجالس کے مجموعہ کی ایک خوبی یہ ہے کہ حضرت والا نے اس پر از اول تا آخر نظر فرمائی ہے، اور نہایت مفید اضافے فرما کر ترتیب کی خامی سے پیدا شدہ

مضامین کی تشنگی کو دور فرما دیا ہے۔

نیز اپنے قیمتی مشوروں سے نواز کر احقر کی ہمت افزائی فرماتے ہیں، اسی ہمت افزائی کا نتیجہ ہے کہ مجالس کی ترتیب کا سلسلہ آگے بڑھ رہا ہے۔

اللہ تعالی سے دعاء ہے کہ پہلی جلد کی طرح دوسری جلد کو بھی مقبولیت عطاء فرمائے، اوران مجالس کی ترتیب کے سلسلہ کو مزید آگے بڑھانے کی توفیق عطاء فرمائے اور امت کو نفع پہنچائے اور میرے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے۔

محمد زبیر احمد قاسمی

خادم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم

۵؍ربیع الاول ۱۴۲۹ھ

باسمہ تعالیٰ

ہم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں

الحمدللّٰہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین الطفیٰ ۔امابعد

فقد قال النبی ﷺ "إِنَّ الدُّنيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَإِنَّكُمْ خُلِقْتُمْ لِلْآخِرَةِ"(أو کما قال علیہ الصلاۃ و السلام)

یہ ایک مختصر حدیث ہے اور یہ حدیث عام طور پر جمعہ کے خطبوں میں بھی پڑھی جاتی ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ''دنیا تمہارے لیے بنائی گئی ہے اور تم آخرت کے لیے بنائے گئے ہو''۔ (شعب الایمان: ۳۶۰/۷)

دنیا ہمارے لئے اور ہم آخرت کے لئے:

دنیا تو ہمارے لیے ہے، لیکن ہم آخرت کے لیے ہیں، اگر یہ مضمون ہم سب کو یاد ہو جائے تو اس مضمون کی روشنی میں زندگی گزارنا آسان ہو جائے گا، آج لوگ بہت پریشان رہتے ہیں اور بار بار اس پریشانی کے نتیجہ میں کہیں اِدھر، کہیں اُدھر بھٹکتے ہی رہتے ہیں۔ اور یہ سب اس لیے ہے کہ دنیا ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، جو آدمی یہ کہہ کر آزاد ہو گیا کہ دنیا میرے لیے ہے اور میں خود آخرت کے لیے ہوں تو وہ آدمی

بھٹک نہیں سکتا اور اس کے لیے زندگی گزارنے میں بڑی آسانیاں ہیں۔

دنیا میں ہمیشہ رہنے کا خیال نہیں ہونا چاہئے، جو آدمی ہمیشہ دنیا میں رہنے کے خیال میں رہتا ہے، بڑی بڑی بلڈنگیں بناتا ہے، بے ضرورت چیزوں میں دل لگاتا ہے اور دنیا کا سامان جمع کرتا رہتا ہے، اور اسے یاد ہی نہیں رہتا کہ مجھے یہ سب کچھ چھوڑ کر جانا ہے تو اسے سکون کی زندگی مل ہی نہیں سکتی۔ چند دن پہلے ایک صاحب کے یہاں جانا ہوا، انہوں نے ایک عالیشان گھر بنایا ہے، میں نے کہا کہ بھائی جیسا بھی گھر بنائیں، لیکن جائیں گے کہاں؟ قبر ہی کے اندر، جیسا بھی گھر بنالو، جیسی بھی بلڈنگ بنالو، کتنی ہی عظیم الشان بنالو، ہر قسم کی راحت کا انتظام کرلو اور عیش و راحت کی سب چیزیں جمع کرلو، لیکن جب مریں گے تو بادشاہ بھی وہیں جائے گا اور فقیر بھی وہیں جائے گا۔ وہاں فقیر یا بادشاہ کا کوئی فرق نہیں ہوگا۔

اور بعض لوگوں نے فرق کرنے کی کوشش کی تھی تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسے عجیب اور انتہائی عبرت ناک واقعات دکھادیے کہ لوگوں نے ہمیشہ کے لیے سیکھ لیا۔

ایک جگہ پر ایک بزرگ کی مزار کے پاس ایک پیر رہتا تھا، اور عام طور پر لوگ اس کے ساتھ ان مقامات کو ''شریف'' کہتے ہیں، جیسے ''کلیر شریف'' گلبرگہ شریف، ''اجمیر شریف'' وغیرہ، اور بعض لوگوں میں ''شریف'' لگانے کی یہ عادت بیماری کی حد تک ہوتی ہے کہ ہر چیز میں شریف لگادیتے ہیں۔

۞ بھوک شریف اور ایک لطیفہ:

اس پر ایک لطیفہ یاد آگیا کہ مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمود صاحب گنگوہی علیہ الرحمہ ایک سفر کے دوران ایک جگہ گئے، وہاں کسی بزرگ کا مزار تھا اور کچھ مجاورین

رہتے تھے تو وہاں کے لوگ ہر چیز میں شریف لگا رہے تھے، حضرت! لیجئے لوٹا شریف، یہ کیجئے وضوء شریف، ادھر ہے بیت الخلاء شریف، سب جگہ شریف شریف۔

حضرت کو ہنسی بھی آ رہی تھی لیکن ہنسی روک کر اپنا کام کرتے رہے، جب نماز وغیرہ سے فارغ ہو گئے، پھر ان بزرگ کے مزار پر جا کر وہاں فاتحہ پڑھی، اس کے بعد واپس آئے تو ان لوگوں نے کہا کہ حضرت! کھانا شریف تیار ہے، اس لیے روٹی شریف کھا لیجئے، تو حضرت نے کہا کہ بھائی بھوک شریف نہیں ہے۔ تو بعض جگہ شریف شریف کا استعمال بہت ہوتا ہے۔

ایک جھوٹے پیر کی قبر کی حالت:

میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک ایسی ہی جگہ ایک صاحب مجاور تھے اور ان کے بہت سارے مرید تھے، اور جو اس قسم کے ڈھکوسلے لوگ ہوتے ہیں، وہ لوگوں کو حقائق سے آگاہ نہیں کرتے، بلکہ گمراہ کرتے رہتے ہیں، تو ان صاحب نے اپنے مریدین کو یوں گمراہ کر رکھا تھا کہ میں کبھی نہیں مروں گا، ہاں تھوڑی دیر کے لیے مجھے موت آئے گی، ظاہری موت، لیکن جب مجھے قبر میں آپ لوگ دفنا دیں گے تو پھر میری وہاں زندگی شروع ہو جائے گی اور اس پیر نے کہا کہ جب میں مر جاؤں گا تو چالیس دن کے بعد پھر واپس آؤں گا، تو ان کے مریدین نے کہا کہ حضرت! آپ کے لیے جو قبر شریف بنے گی وہ قبر شریف کیسی بنی چاہیے۔ تو انہوں نے کہا کہ اس میں ایسے ٹائلس لگاؤ اور یوں اس میں پینٹ لگاؤ، یوں زیب وزینت کرو اور اسی کے ساتھ اس میں ''اے سی'' بھی فٹ کرو۔ مریدین نے کہا کہ ہاں! ہم اسی طرح تیار کریں گے، چنانچہ وہ صاحب ابھی موجود ہی تھے، زندہ ہی تھے، اسی وقت ان

کے لیے قبر تیار کی گئی، سارے انتظامات کر دیے گئے، اور عالی شان قبر تیار ہو گئی، ٹائلس اور پھول و بوٹے سب لگائے و بنائے گئے، باہر سے تار کھینچ کر اس میں ''اے سی'' فٹ کی گئی۔

دیکھئے ! اس کے مریدین کس قدر پکے تھے، اگرچہ شیخ کچا تھا، عام طور پر ایسا دیکھنے میں آیا کہ سچے پیروں کے مرید بڑے کچے ہوتے ہیں، اور کچے پیروں کے مرید بڑے پکے ہوتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا کیا راز ہے، لیکن عام طور پر آجکل دیکھا ایسے ہی گیا ہے۔

اس کے بعد بہر حال وہ وقت جو سب کو آنا ہے، اس کو بھی وہ وقت آ گیا، یعنی موت کا وقت، جب وہ مر گیا تو اس کے مریدین نے اس کو نہلایا، دُھلایا، اور لے جا کر دفن کر دیا، دفن کرنے کے بعد'' اے سی'' بھی چالو کر دیا؛ تا کہ اندر حضرت کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگے۔ اس کے بعد انتظار شروع کر دیا کہ حضرت تشریف لائیں گے، لیکن وہ تشریف کب لاتے ؟

بہت دن ہو گئے تو اس کے بعد ان لوگوں نے آپس میں کہا کہ بھائی! پیر صاحب نے چالیس دن میں واپس آنے کا وعدہ کیا تھا، مگر چالیس دن ہو چکے ہیں، ابھی تک نہیں آئے، کیا بات ہے، ذرا خبر تو لے لیں۔ مشورہ کیا گیا اور قبر کو کھولنے کی بات تجویز کی گئی۔ پیر صاحب کی وہ قبر ایسی بنائی گئی تھی کہ قبر کے اوپر ایک دروازہ بنایا گیا تھا تا کہ آسانی سے کھولا جا سکے، گویا کہ گھر ہی بنا دیا تھا۔ اب جب اس کو کھولا تو عجیب وغریب تماشا نظر آیا، عذاب کی کیفیت نظر آئی، اور جو'' اے، سی'' انہوں نے فٹ کی تھی، جو کچھ ٹیلس وغیرہ لگائے تھے، اس کا تو اس میں نام ونشان نہیں تھا، وہاں تو کچھ اور ہی کیفیت اور حالت تھی، بس جناب عبرت ہوتی ہے۔

ایمان و عمل سے قبر کو بناؤ:

الغرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ کیسا بھی آدمی دنیا میں آئے، جانا ہی ہے اور قبر کے گڑھے میں ہی رہنا ہے، کسی کے لئے کوئی عالی شان مکان نہیں بنایا جاتا، پھر جب وہاں پر جائے گا تو اس کے ایمان و اعمال کے مطابق حساب و کتاب ہوگا۔ ہاں! اچھے لوگ ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے قبر کو بڑی بہترین جگہ بنادے گا، وہاں ان کے لیے ہر قسم کی راحت ہوگی۔ قبر کو مال کے ذریعہ بہترین ٹائلس اور پینٹ اور رنگ وروغن اور اے سی وفرنیچر سے بنایا نہیں جاتا، بلکہ قبر کو ایمان واعمال سے بنایا جاتا ہے۔

اگر یہ پیر اللہ پر یقین رکھنے والا ہوتا، واقعی آخرت کا اس کو یقین ہوتا اور اللہ کی طرف سے ہونے والے سوالات پر اس کو یقین ہوتا، وہاں کی نعمتوں پر ایمان ہوتا تو وہ آدمی کبھی یہ نہ کہتا کہ آپ لوگ میرے لیے ان ان چیزوں کا انتظام کرو، اس لیے کہ اگر اسے آخرت کی چیزوں پر یقین ہوتا تو وہ کہتا کہ دنیا کی چیزیں کیا ہیں؟ اصل اے سی وہاں ہوگی، یہ دنیا کی اے سی کیا ہے؟ اصل نعمتیں تو وہاں ہوں گی، یہاں کی کیا نعمتیں ہیں؟ وہ ایسی ایسی نعمتیں ہیں کہ جن کو کسی انسان نے آج تک دیکھا نہیں ہے، اور کسی انسان کے دل پر ان کا خطرہ بھی نہیں گزرا۔

ایسی ایسی چیزیں اللہ نے مسلمانوں کے لیے، مومنوں کے لیے تیار کی ہیں، چنانچہ اللہ تعالی نے قرآن میں فرمایا:

﴿ لَاتَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴾ [السجدة : ۱۷]

(نیک لوگوں کے لیے بطور جزاء ایسی ایسی چیزیں تیار رکھی گئی ہیں کہ کسی نفس کو اس کی خبر تک نہیں ہے)

تو جسے اس آیت پر یقین ہوگا وہ کہے گا کہ یہاں کی کوئی چیز مجھے نہیں چاہئے، مجھے تو ہاں کی چیز چاہئے۔

آخرت کی فکر و تیاری:

بہر حال یہ قصہ تو درمیان میں یاد آ گیا، بتا یہ رہا تھا کہ ہر آدمی مرنے کے بعد جاتا ہے قبر میں اور وہاں بادشاہ و امیر ہو، یا غریب و فقیر ہو، سب کے لیے یکساں نظام ہے، اسی مٹی میں سب کو جا کر سونا ہے، اس لیے ہمیں آخرت کے لیے ابھی سے محمد رسول اللہ ﷺ نے متوجہ کیا اور فرمایا کہ "اِنَّکُمْ خُلِقْتُمْ لِلآخِرَۃِ" (تم تو پیدا ہی کئے گئے ہو آخرت کے لیے) ہاں "اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ" (دنیا تمہارے لیے بنائی گئی ہے) لہٰذا تم ضرورت کے لیے اس دنیا میں سے کھاؤ، پیو، اس میں رہو، سہو اور اس کو استعمال کرو، لیکن اصل چیز جس پر توجہ دینی ہے وہ یہ ہے کہ میری ساری زندگی، میرا کھانا اور پینا اور میری ساری راحتیں سب کچھ اللہ کے لیے ہونا چاہئے اور آخرت کی تیاری کے لیے ہونا چاہئے۔

مولانا حکیم اختر صاحب کہتے ہیں کہ بھائی ہم چاہے لندن میں ہوں یا پاکستان میں یا ہندوستان میں ہوں، زمین کے جس گوشے میں ہوں اور چاہے ہم کو کسی ملک کی نیشنلٹی مل جائے، لیکن دنیا کے ہم نیشنل نہیں ہیں، ہماری سٹیزن شپ تو جنت کی ہے، اور لوگ کہتے ہیں کہ یہاں کی نیشنلٹی مل جائے، وہاں کسی کی نیشنلٹی مل جائے اور اس کے لیے پریشان ہو رہے ہیں، تگ و دو ہو رہی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے تو ہم کو وہاں کی نیشنلٹی دے کر بھیج دیا ہے، اس لیے ہم کو تو وہاں کی تیاری کرنی ہے، اور ہم

وہاں کے باشندے بنے رہیں، اس کی فکر زیادہ ہونا چاہئے۔ ایک دن ہم کو دنیا سے ضرور جانا ہے، خواہ ہماری بلڈنگ دو ہزار گز کی ہو، بعض رئیس ہمارے یہاں ایسے ہیں کہ دو دو ہزار گز کی بلڈنگ میں رہتے ہیں، مگر آخر میں ان کو زمین کے نیچے دو گز کی قبر ملتی ہے، البتہ جو نیک لوگ ہیں اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو تا حد نظر جہاں تک کہ ان کی نظر جا سکتی ہے وہاں تک کشادہ فرما دیں گے۔

❁ قبر میں فرشتوں کے سوالات:

حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب بندے کو دفن کیا جاتا ہے، دو فرشتے جن میں سے ایک کا نام منکر اور دوسرے کا نام نکیر ہوگا اللہ کی طرف سے آتے ہیں، ان فرشتوں کی حالت بڑی خطرناک قسم کی ہوتی ہے، ان کی شکلیں اور صورتیں آدمی دیکھے تو گھبرا جائے، کالی رنگت اور آنکھیں نیلی، کس قدر ڈراؤنی شکل ہوگی؟ آواز ان کی بڑی گرج دار ہوتی ہے، ہاتھ میں ان کے گرز ہوتے ہیں، وہ ان کو لے کر آتے ہیں اور آدمی سے سوال کرتے ہیں۔

وہ سوال کیا ہوتا ہے "مَنْ رَّبُّکَ" (تیرا رب کون ہے؟) دوسرا سوال یہ ہوگا "مَا دِیْنُکَ" (تیرا دین کیا ہے) اور تیسرا سوال ہوگا "مَنْ ھٰذَا الرَّجُلُ الَّذِیْ بُعِثَ فِیْکُمْ" (یہ آدمی کون ہے جو تم میں بھیجا گیا تھا)، ان کو پہچانتے بھی ہو یا نہیں۔ مؤمن اس کو صحیح صحیح جواب دے دیگا، فرشتے کہیں گے کہ ہم جانتے تھے تو تو ایسا ہی جواب دیگا، پھر آسمان سے ایک منادی آواز دیگا کہ میرے بندے نے سچ کہا، اس کے لئے جنت کا بچھونا لگاؤ اور جنت کا اس کو لباس پہناؤ، اور جنت کی جانب دروازہ کھول دو نیز اس کے لئے تا حد نظر قبر کو وسیع کر دیا جائے گا، جب اس کے لئے یہ سب انتظامات ہوں گے تو وہ آدمی خوشی میں کہہ اُٹھے گا کہ میں اپنے گھر والوں کے

پاس جا کران کوان باتوں کی خبر دینا چاہتا ہوں، مگر فرشتے اس سے یہ کہیں گے کہ "نَمْ کَنَوْمَةِ الْعَرُوْسِ" (کہ دلہے یا دلہن کی طرح سوجا) اب تجھے اللہ کے سوا کوئی نہیں جگائے گا، اور اگر وہ مرنے والا کافر یا منافق ہوگا تو جواب میں ہاہ ہاہ کہے گا اور کہے گا کہ میں کچھ نہیں جانتا، لوگ جو کہتے تھے میں بھی وہی الٹی سیدھی کہہ دیا کرتا تھا، آسمان سے آواز آئے گی کہ اس نے جھوٹ کہا ہے اس کو جہنم کا لباس پہناؤ اور آگ کا بچھونا لگا دو اور دوزخ کی طرف دروازہ کھول دو، نیز اس کے لئے قبر کو اس قدر تنگ کر دیا جائے گا کہ اس کی ایک جانب کی پسلیاں دوسری جانب کی پسلیوں میں گھس جائیں گی۔ (مسند احمد: ۲۶۷/۴، مصنف ابن ابی شیبہ: ۵۴/۳)

غور کرو کہ قبر کی منزل کس قدر قابل عبرت ہے؟ اگر ایمان و عمل ہوگا تو اس کے لئے قبر جنت ہے ورنہ قبر جہنم ہے۔

رابعہ بصریہؒ کا فرشتوں سے مناظرہ:

ہاں اللہ کے نیک بندوں کے لئے وہاں کوئی پریشانی و گھبراہٹ نہ ہوگی ، جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ مؤمن کو جب قبر میں بٹھایا جائے گا تو "یجلس غیر فزع و مشغوب" (وہ اٹھ بیٹھے گا اس حال میں کہ وہ نہ خوف کھائے گا اور نہ پریشان ہوگا)، اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا کہ حضرت رابعہ بصریہؒ کا جب انتقال ہوگیا، کسی کے خواب میں وہ آئیں، خواب دیکھنے والے نے پوچھا کہ آپ کا انتقال ہوگیا تھا، اللہ کے پاس کیسے گزری، تو کہا کہ جب مجھے دفن کیا گیا، تو فرشتے آئے پوچھنے اور سوال کرنے کے لیے، انہوں نے مجھ سے پوچھا "مَنْ رَّبُّكَ" تو میں نے کہا کہ تم کون ہو؟ کہا کہ ہم اللہ کے فرشتے ہیں، میں نے پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو؟ کہا کہ آسمان سے آئے ہیں، میں نے پوچھا کہ آسمان یہاں سے کتنی دوری اور فاصلہ

پر ہے؟ تو کہا کہ پانچ سو برس کا فاصلہ ہے، آدمی کی رفتار سے یہاں کوئی چلے تو پانچ سو برس میں آسمان اول پر پہنچے گا۔ ہاں فرشتہ کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے، اس لئے وہ وہاں سے ایک لمحہ میں آجاتا ہے، وہ تو اس کو اللہ نے قدرت دی ہے، تو انہوں نے کہا کہ یہاں سے پانچ سو برس کا فاصلہ ہے، تو میں نے کہا کہ اچھا تم کو معلوم ہے کہ تمہارا رب کون ہے؟ کہا کہ ہاں ہم کو معلوم ہے، میں نے کہا کہ جب پانچ سو برس کے فاصلہ کو طے کر کے تم خدا کو نہیں بھولے تو میں دو گز زمین سے نیچے آ کر اپنے رب کو کیسے بھول جاؤں گی۔

دیکھئے! اللہ کے نیک بندوں کا کچھ مقام بھی ہوتا ہے، وہ اللہ کے فرشتوں کو بھی ایسا جواب دے دیتے ہیں جو ''لاجواب'' ہوتا ہے۔

ایک نحوی عالم کا لطیفہ:

مجھے ایک اور لطیفہ یاد آ گیا، عربی جاننے والوں کے لیے یہ لطیفہ سناتا ہوں، ہاں جو عربی نہیں جانتے ہیں ان کو مزہ نہیں آئے گا، مزہ کیا، سمجھ میں بھی نہیں آئے گا، لیکن یہاں اہل علم حضرات بھی ہیں اور طلبۂ کرام بھی ہیں، اس لیے عرض کرتا ہوں، وہ یہ کہ مظاہر علوم سہارنپور میں ایک استاد بزرگ تھے، اور وہ نحوی تھے، فن نحو میں ان کو بڑی مہارت تھی، وہ ہر بات میں نحو کو سامنے رکھ کر کلام کرتے تھے، جب ان کا انتقال ہوا تو طلبہ آپس میں کہنے لگے کہ حضرت کے پاس فرشتے آئے ہوں گے منکر نکیر اور انہوں نے حضرت سے پوچھا ہوگا ''مَنْ رَّبُّكَ'' (تیرا رب کون ہے؟) تو انہوں نے جواب میں کہا ہوگا ''مَنْ رَّبُّكَ'' (وہ جو تیرا رب ہے)

یعنی فرشتوں کے سوال میں '' من '' استفہامیہ ہے اور جواب کے اندر ''من'' موصولہ ہے۔ تو بظاہر سوال بھی وہی جواب بھی وہی، مگر معنی بالکل الگ، زندگی میں

ان کا جو طریقہ تھا اس کو سامنے رکھ کر طلبہ آپس میں یہ کہہ رہے تھے۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ اللہ کے منکر نکیر فرشتے آتے ہیں، سوال و جواب ہوتا ہے۔ جب نیک بندہ جواب دے دیتا ہے، اس کی قبر کو تا حد نظر وسیع کر دیا جاتا ہے۔ اور جب آدمی برا ہوتا ہے تو اس کی قبر کو تنگ کر دیا جاتا ہے۔

حضرت عثمان کا قبر کے خوف سے رونا:

اسی لئے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کسی قبر کو جب دیکھتے، قبر پر کھڑے ہوتے تو بہت رویا کرتے تھے، حتی کہ آپ کی ڈاڑھی تر ہو جاتی، لوگوں نے ان سے پوچھا کہ آپ جنت و دوزخ کے ذکر پر اس قدر نہیں روتے جتنا کہ قبر کو دیکھ کر روتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں! اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ قبر آخرت کی پہلی منزل ہے جو یہاں کامیاب ہو گیا اس کے لئے اگلی منزلیں اس سے زیادہ آسان ہوں گی اور جو اس سے نجات نہیں پایا اس کے لئے اس کے بعد کی منزلیں اور زیادہ مشکل ہوں گی، نیز فرمایا کہ: ما رأيتُ منظراً قطُّ إلّا و القبر أفظع منه" (میں نے قبر سے زیادہ بھیانک کوئی منظر نہیں دیکھا)۔

(ترمذی: ۲۳۰۸، ابن ماجہ: ۴۲۶۷، مسند احمد: ۴۵۴، مستدرک حاکم: ۵۳۶/۱)

بہر حال قبر ایک بھیانک جگہ ہے اگر اس کو ایمان و عمل سے تیار نہ کیا گیا، اسی تیاری کے لئے ہمیں یہ دنیا دی گئی ہے، دنیا عیش و عشرت کے لئے نہیں ہے، بلکہ ایک عبرت کا مقام ہے، اور یہ حقیقت قبر میں جا کر کھلے گی، مولانا حکیم اختر صاحب دامت برکاتہم نے اپنے ایک شعر میں دنیا کی حقیقت بیان کی ہے، ان کا شعر ہے ؎

یوں تو دنیا دیکھنے میں کس قدر خوش رنگ تھی

قبر میں جاتے ہی دنیا کی حقیقت کھل گئی

یہاں سے لوگ جب جائیں گے تو معلوم ہوجائے گا کہ دنیا کی حقیقت کیاہے دنیاخاک نظرآئے گی۔

افلاطون کی حضرت موسیٰؑ سے ملاقات:

مجھے اس پر ایک قصہ یادآ گیا، بڑا عجیب وغریب قصہ ہے اور یہ حضرت تھانویؒ نے بیان فرمایاہے کہ افلاطون جو بہت بڑاحکیم اوراپنے زمانہ کے بڑے عقلمند لوگوں میں شمارہوتاہےاور وقت کا بہت بڑافلسفی تھااوراس کی تحقیقات دنیامیں آج بھی معتبر ومستند مانی جاتی ہیں، کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا تھا،اس کے بارے میں لکھاہے کہ وہ جنگل میں ایک معمولی جھونپڑے میں رہتا تھا،لوگوں سے میل ملاپ نہیں رکھتا تھا،اگرکسی کواس سے ملنا ہوتا تو پہلے سے اجازت لینی پڑتی تھی،وہ اللہ کوتو مانتا تھا،مگر رسولوں کونہیں مانتا تھا،حضرت موسی علیہ السلام سے ایک دفعہ اس کی ملاقات بھی ہوئی تھی،حضرت موسی نے اس سے کہا کہ میں اللہ کا نبی ہوں،میرے اوپرایمان لاؤ۔تواس نے کہا کہ میراایک سوال ہے،وہ یہ کہ فرض کیجئے کہ اللہ تعالی تیر پھینک رہاہےاور بندوں کی جانب پھینک رہاہے،اور بندے اس کا نشانہ ہیں، اوراللہ کے تیریہ مصیبتیں اور پریشانیاں ، بیماریاں و حادثات ہیں، اگر بندے اللہ تعالی کے ان تیروں سے بچناچاہیں تو کیا طریقہ ہے؟ حضرت موسی نے اس کے سوال پر فی البدیہ جواب دیا کہ تیر پھینکنے والے کی بغل میں بیٹھ جاؤ،اس لیے کہ تیر پھینکنے والاتو سامنے تیر پھینکے گا،اپنی بغل میں نہیں پھینکے گا۔مطلب یہ تھا کہ اللہ کےقریب ہوجاؤ،جواللہ کےقریب ہوجائے گااُسے تیرکیسے لگے گا؟اور جودوررہے

گا ظاہر ہے کہ اسے تیر لگے گا۔ جب یہ جواب حضرت موسیٰ نے دیا تو وہ خوشی سے اچھل پڑا اور کہنے لگا کہ ایسا فی البد یہ جواب تو شاید دنیا میں کوئی دے نہ سکے، اور کہا کہ واقعی آپ اللہ کے نبی ہیں، میں مانتا ہوں، لیکن آپ جاہلوں کے لیے ہیں، آپ کی مجھے ضرورت نہیں، کیونکہ میں تو بڑا عقلمند اور فلسفی ہوں۔

دنیا کی حقیقت، افلاطون کی نظر میں:

الغرض ایک مرتبہ اس زمانے کا بادشاہ اپنے کچھ لوگوں کے ساتھ اس سے ملنے جنگل گیا، ملاقات ہوگئی اور بادشاہ نے سوال کیا کہ آپ یہاں جنگل میں رہتے ہیں مگر یہاں آپ کے پاس کھانے اور پینے کی کوئی چیز بھی بظاہر نظر نہیں آتی، یہ کہتے ہوئے بادشاہ نے کچھ جملے ایسے استعمال کیے جس سے ایسا لگتا تھا کہ وہ اس کی حقارت کر رہا ہے۔ افلاطون کو یہ بات ناگوار گزری کہ دنیا کو یہ بہت کچھ سمجھتا ہے اور ہماری یہ حالت دیکھ کر ہم کو حقیر سمجھ رہا ہے، اس لئے افلاطون نے بادشاہ کو کچھ سبق پڑھانا چاہا، اس لئے افلاطون نے بادشاہ کے رخصت ہونے کے موقعہ پر اس سے کہا کہ جناب! میری ایک گزارش ہے، وہ یہ کہ فلاں وقت آپ ہمارے یہاں تشریف لائیں، میں آپ کی دعوت کرنا چاہتا ہوں، اور صرف آپ کی نہیں، آپ کے تمام وزراء کی، ارکان دولت کی اور آپ کے مشیروں کی، اور آپ کے فوجیوں کی، سب کی دعوت ہے۔

اس کی بات کا بادشاہ انکار بھی نہیں کر سکتا تھا، اس لئے اس نے افلاطون کی دعوت قبول کرلیا۔ اب جب وہ دعوت کا وقت آیا تو اپنے پورے لشکریوں کے ساتھ، اپنے وزراء کے ساتھ، ارکان دولت کے ساتھ بادشاہ اس جنگل کی طرف چلنے لگا،

جنگل کے قریب پہنچے تو دور ہی سے سب کو نظر آ رہا تھا کہ یہاں سے وہاں تک عظیم الشان قسم کی بلڈنگیں ہیں، راستے بنے نظر آ رہے ہیں، بہترین انتظامات نظر آ رہے ہیں، جنگل میں منگل ہو گیا ہے، یہ دیکھ کر سب لوگ حیران رہ گئے کہ چند دنوں کے اندر اتنی بلڈنگیں یہاں کس نے بنادی ہیں، یہ راستے کس نے بنا دیے ہیں، اتنا بہترین انتظام کس نے یہاں کر دیا ہے۔ خیر! اب جو وہاں پہنچے، تو افلاطون کے لوگ وہاں استقبال کے لیے موجود تھے، لوگوں نے ان کا استقبال کیا اور لے جا کر ہر ایک کو اپنے اپنے مقام پر پہنچا دیا، دیکھا تو بادشاہ کے لیے مخصوص عمارت تھی، وزیروں اور مشیروں کے لئے الگ انتظام تھا، جب کھانے کا وقت آیا تو بہترین قسم کے کھانے پیش کئے گئے، سب نے کھانا کھایا، اور خوب سیراب ہوئے، اور جب رات کا وقت آیا تو سب لوگ آرام کرنے اپنی اپنی بلڈنگوں میں پہنچ گئے اور سو گئے، لیکن صبح اٹھے تو دیکھتے ہیں کہ جنگل میں نہ کوئی بلڈنگ ہے، نہ کوئی راستہ ہے، اور نہ کوئی بچھونا ہے نہ اوڑھنا، کچھ بھی نہیں ہے، بالکل صاف جنگل ہے، سب کے سب جنگل میں نیچے پڑے ہوئے ہیں، اُدھر بادشاہ بھی نیچے پڑا ہوا ہے، اور اس کے وزیر بھی نیچے پڑے ہوئے ہیں، یہ دیکھ کر سب پریشان بھی ہوئے اور غصہ بھی ہوئے۔

افلاطون نے کہا کہ جو کچھ تم نے دیکھا تھا وہ دراصل میرے خیال کا نتیجہ تھا، قوت خیالیہ کا کرشمہ تھا، قوت خیالیہ سے آپ کے ذہنوں میں میں نے یہ بلڈنگیں ڈال دیں، یہ عجیب وغریب تماشہ آپ کو دکھا دیا، حقیقت میں کچھ نہیں تھا، میں نے تم کو یہ بتانا چاہا کہ جب تم آخرت میں جاؤ گے تو یہ دنیا کی زیب وزینت، بلڈنگیں و عمارتیں جسے تم سب کچھ سمجھتے ہو، اسی طرح محض ایک خیالی صورتیں نظر آئیں گی۔

❁ قوتِ خیالیہ کی حقیقت:

یہ قوتِ خیالیہ بڑی عجیب وغریب چیز ہے، ہوسکتا ہے کہ بعض لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا ہو، اس لئے سن لیں کہ آج کی دنیا میں مسمریزم کے نام سے یہ ایک فن چل رہا ہے، اسے ''ہپناٹزم'' بھی کہتے ہیں، اس کے ذریعہ ایسے بہت سارے کام انجام دیے جاتے ہیں، اس کو عربی میں ''عمل تنویم'' کہتے ہیں۔

ایک انگریز مصنف نے لکھا ہے کہ ہم ہپناٹزم کے ذریعہ ایسا کر سکتے ہیں کہ ایک آدمی کو پانی دیں اور اس کے خیال میں یہ ڈالیں کہ تو شراب پی رہا ہے، اور وہ یہ پانی پئے گا تو اسے نشہ آئے گا، حالانکہ وہ پانی پی رہا ہے، نشہ کیسے آسکتا ہے؟ یہ دراصل قوتِ خیالیہ کا کرشمہ ہے اور قوت خیالیہ تمام انسانوں میں ہوتی ہے، لیکن بعض لوگ اس کو قوت دیتے ہیں، ترقی دیتے ہیں، پروان چڑھاتے ہیں تو بہت آگے تک پہنچ جاتی ہے اور ایسے لوگ کچھ عجیب وغریب چیزیں دکھانے لگتے ہیں، اسی کو تصرف بھی کہا جاتا ہے۔

قوت خیالیہ اور عاملوں کا دھوکہ:

اور یہ عاملین کے یہاں بھی چلتا ہے، عاملین فال دیکھتے ہیں انجن کے نام سے، یہ بھی دراصل قوت خیالیہ کا اثر ہوتا ہے، لوگ اسے سمجھتے ہیں کہ کوئی حضرت والا تشریف لاکر غیب کی باتیں بیان فرمارہے ہیں، وہ ایسے ہی حضرت ہیں، جیسے کہ وہاں افلاطون کے پاس لوگوں کو بلڈنگیں نظر آئی تھیں، کیا ان کی کوئی حقیقت تھی؟ نہیں محض خیالات کا کرشمہ تھا، عامل لوگ معصوم بچوں اور بچیوں کے ذہن پر یہ ڈالتے ہیں کہ اس کو ''کاغذ'' پر یا ''پان'' پر کچھ صورتیں نظر آرہی ہیں اور یہ موکل ہیں جو غیب کی باتیں جانتے ہیں، حالانکہ یہ سب غلط اور جھوٹ ہے، یہ سب دراصل باہر کچھ نہیں ہوتا، بلکہ اس کے دماغ میں نظر آتا ہے۔

اب بچہ عامل کی اس وقت کے زیر اثر جب دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ ہاں! مجھے ایک ڈاڑھی والے حضرت نظر آرہے ہیں، ایسا لباس پہنے ہیں، کچھ بول رہے ہیں، اب وہ عامل اس سے سن کر لوگوں کو سنا دیتا ہے کہ بات ایسی ایسی ہے۔

یہ سب کا سب محض ایک دھوکہ ہے، حقیقت کچھ نہیں، کیونکہ ذرا غور کرو کہ اگر ان حضرت کو آ کر کچھ بولنا ہی تھا تو بچے سے ہی کیوں بولتے ہیں؟ خود اسی عامل سے کیوں نہیں بتا دیتے؟ اور یہ حضرت عامل کو کیوں نظر نہیں آتے، صرف بچہ ہی کو کیوں نظر آتے ہیں، ذرا سوچ کر تو دیکھئے، بات یہ ہے کہ یہ عاملین بچوں سے یہ کام اس لیے لیتے ہیں کہ بچے کا ذہن بہت کمزور ہوتا ہے، کچا ہوتا ہے، قوت خیالیہ فوراً اس پر اٹیک کرتی ہے، اور اس کے برخلاف بڑے آدمی پر اثر ڈالنے کے لئے بڑی قوت چاہئے، اور یہ آسان نہیں ہے، اس کے لئے افلاطون جیسے لوگوں کی قوت درکار ہوتی ہے، اتنی بڑی قوت ان عاملین بیچاروں کے پاس کہاں ہوگی؟ اس لیے چھوٹے چھوٹے بچوں کو استعمال کر کے لوگوں کو بہکاتے ہیں کہ حضرت آرہے ہیں اور موکل آرہے ہیں، فلاں یوں فرما رہے ہیں، اور عوام لوگ ان کے پاس جا کر ان کی باتوں سے بہک جاتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں کہ ہاں ضرور کوئی بات ہے۔

قوت خیالیہ کی ایک مثال سے وضاحت:

قوت خیالیہ کو سمجھنے کے لئے ایک موٹی سی مثال دیتا ہوں، جو میں نے میرے حضرت شاہ مسیح الامت نور اللہ مرقدہ سے سنی ہے، حضرت فرماتے تھے کہ قوت خیالیہ ہر ایک میں ہوتی ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ کبھی آپ آنکھ بند کر کے آنکھوں کو رگڑتے رہئے اور خیال جماتے رہئے تو آپ کے خیال میں عجیب عجیب تماشے

نظر آئیں گے، عجیب عجیب شکلیں نظر آئیں گی، تعجب انگیز رنگتیں سامنے آئیں گی، اور ایسی چیزیں دکھائی دیں گی کہ باہر ان کا کوئی وجود بھی نہ ہوگا، یہ ظاہر ہے کہ حقیقت میں کچھ نہیں ہے بلکہ قوت خیالیہ ان چیزوں کو ہمارے ذہن میں بناتی ہے، اور جب یہی قوت بڑھتی ہے تو دوسری طرف بھی یہ اثر انداز ہو جاتی ہے۔

اس کی ایک دوسری مثال یہ کہ ایک دریا ہے، دریا کے بیچ میں یا کنارے پر ایک دیوار ہے، بہت اونچی دیوار ہے اور دیوار کے دونوں طرف کو نیچے سے پانی بہہ رہا ہے، اور دیوار پر چلنے کے لئے اچھا خاصا دو تین فیٹ کا راستہ بھی ہے، اگر اس راستہ پر آپ کو چلنے چھوڑ دیا جائے تو آپ اس پر آسانی سے چل سکتے ہیں یا ڈگمگانے لگتے ہیں؟ آپ سے اس پر آسانی سے چلا نہیں جا سکے گا، حالانکہ وہاں راستہ تو ہے، جتنا آپ کو نیچے چلنے کے لیے راستہ چاہئے، اس سے کچھ بڑا ہی راستہ وہاں موجود ہے، لیکن آپ پریشان ہوتے رہیں گے اور ایسی حالت ہوگی کہ گرنے لگیں گے، بڑا سنبھل کر چلنا پڑے گا، اور کبھی چکر آجائے گا، بہت سارے لوگ تو چل ہی نہیں سکتے۔

اب یہاں سوال یہ ہے کہ آخر یہاں ایسا ہوتا کیوں ہے؟ یہ چکر کیوں آرہا ہے؟ اور چلنے میں دشواری کیوں ہورہی ہے؟ جبکہ پیروں میں پوری طاقت و قوت موجود ہے۔ ہمارے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ دراصل یہ قوت خیالیہ کی وجہ سے ہوتا ہے، قوت خیالیہ بار بار اندر سے کہتی ہے کہ تو گر جائے گا، تو گر جائے گا، یہ خیال بڑی مضبوطی سے دل پر دماغ پر سوار ہو جائے گا اس لیے گرنے لگتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ قوت خیالیہ بڑی عجیب چیز ہے۔

الغرض دنیا کی حقیقت سمجھانے کے لئے افلاطون کا واقعہ بیان کیا تھا کہ اس نے بادشاہ کو اپنی قوتِ خیالیہ سے بلڈنگیں اور زیب وزینت کی چیزیں دکھا کر یہ بتا دیا کہ دنیا کی حقیقت کچھ نہیں، محض ایک خواب ہے۔

پھر جب قوتِ خیالیہ کا ذکر آ گیا تو چونکہ لوگ اسے جانتے نہیں، اس لئے تھوڑی وضاحت کرنی پڑی۔

آخرت کتنی قریب ہے:

فرمایا کہ آج لوگ یہ خیال کر کے کہ آخرت تو بہت دور ہے، بے جھجک گناہ کرتے رہتے ہیں، اور دنیا سے ایسا دل لگا لیتے ہیں گویا انہیں مرنا ہی نہیں ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے یہاں آئے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے، دنیا میں کسی کو قرار نہیں ہے، دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لئے نہ کوئی آیا ہے نہ ہی آئیگا، دراصل قیامت کو دور تصور کرنے کی وجہ سے انسان غفلت کی زندگی گذارتا ہے، حالانکہ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ”بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ “(میں اور قیامت اس طرح بھیجے گئے ہیں، یہ کہہ کر آپ نے شہادت کی اور بیچ کی انگلی سے اشارہ کیا۔(بخاری:۴۶۵۲، مسلم:۲۹۵۱،ترمذی:۲۲۴۱وغیرہ)

اس حدیث میں آپ ﷺ نے قیامت کو اتنا قریب بتایا ہے جتنا کہ دو انگلیاں آپس میں ایک دوسرے کے قریب ہوتی ہیں، کہ جتنا فاصلہ بیچ کی اور شہادت کی ان دو انگلیوں کے درمیان ہے اتنا ہی میرے اور قیامت کے درمیان ہے۔

ایک اور حدیث یاد آ گئی حضرت انس روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا

کہ ''مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ'' (جو آدمی مرجاتا ہے اس کی قیامت شروع ہوجاتی ہے)(حلیۃ الاولیاء:۶/۲۶۷)

اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ آخرت اگرچہ دور ہو لیکن انسان کے مرتے ہی اس کی قیامت شروع ہوجاتی ہے، کیونکہ قبر آخرت کی پہلی منزل ہے، اس اعتبار سے بھی آخرت بہت قریب ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے پاس صرف بصارت ہے ،اس لئے ہمیں آخرت دور نظر آتی ہے،انبیاء کے پاس بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی ہوتی ہے،اس لئے ان کو آخرت قریب نظر آتی ہے،ہمیں بھی اگر بصیرت حاصل ہوجائے اور وہ ایمانی وروحانی آنکھیں مل جائیں تو ہمیں بھی آخرت کی منزل قریب نظر آنے لگے۔

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے کچھ صحابہ کرام کو دیکھا کہ وہ جھونپڑے کی مرمت واصلاح میں مشغول ہیں، یہ دیکھ کر آپ نے ان سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ عرض کیا کہ ہم اس جھونپڑے کی مرمت واصلاح کررہے ہیں، آپ نے فرمایا کہ '' وأما أن الأمر أعجل من ذلك'' آخرت تو اس سے بھی زیادہ قریب ہے۔(مسند احمد:۲/۱۶۱)

سلیمان التیمی کا واقعہ:

حضرت سلیمان التیمی ایک بڑے درجے کے محدث اور بزرگ گزرے ہیں، ان کے صاحبزادے حضرت معتمر بن سلیمان کہتے ہیں کہ ہمارے والد کا ایک مکان تھا، جس میں وہ رہا کرتے تھے، وہ بوسیدہ ہونے کی وجہ سے گرگیا تو انہوں نے ایک

خیمہ گاڑ لیا اور مرتے دم تک اسی میں رہے، لوگوں نے ان سے کہا کہ حضرت! آپ اس مکان کو کیوں نہیں بنا لیتے! تو فرمایا کہ معاملہ تو اس سے بھی زیادہ قریب ہے کہ موت آجائے۔ (حلیۃ الاولیاء: ۳۰/۳)

ادھر آنکھ بند ہوتے ہی نظر آجائے گا کہ جنت ہے، جہنم ہے، عذابات کا سلسلہ ہے، فرشتے ہیں وغیرہ، تو آنکھ بند ہونے میں کتنی دیر ہے بھائی! ایک سکینڈ لگے گا، تو سمجھ لو کہ آخرت بھی اتنی ہی قریب ہے۔

ایک بات یہ بھی سمجھ لو کہ قیامت کو دور تصور کرنا دراصل کافروں کا نظریہ ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا کہ ﴿ اِنَّھُمۡ یَرَوۡنَہٗ بَعِیۡدًا وَّنَرٰىہُ قَرِیۡبًا ﴾ [المعارج: ٦-٧] (بلاشبہ وہ (کفار) قیامت کو دور سمجھ رہے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں)

قرآن کریم میں اس معنی کی اور بھی آیتیں دیگر مقامات پر موجود ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کو دور سمجھنا کفار کا نظریہ ہے، اسی لئے کفار دنیا میں عیش کر رہے ہیں، ان کو کوئی رکاوٹ نہیں ہے، لیکن مؤمن کی شان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ آخرت کو قریب تصور کر کے زندگی گذارتا ہے، اللہ سے ملاقات کا متمنی ہوتا ہے، جہنم کے خوفناک مناظر اور جنت کے حسین مناظر ہر وقت اس کے پیش نظر ہوتے ہیں۔

اللہ سے ملاقات کا یقین نفس مطمئنہ کی صفت:

آپ ﷺ سے ایک دعاء منقول ہے، جس میں آپ نے اللہ سے نفس مطمئنہ کا سوال کیا ہے، فرماتے ہیں: ”اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ أَسۡئَلُكَ نَفۡساً بِكَ مُطۡمَئِنَّةً تُؤۡمِنُ بِلِقَائِكَ وَتَرۡضٰی بِقَضَائِكَ وَتَقۡنَعُ بِعَطَائِكَ “(اے اللہ! میں آپ سے

نفس مطمئنہ کا سوال کرتا ہوں جو تیرے سے ملاقات کا یقین رکھتا ہو اور تیرے فیصلہ پر راضی ہو اور تیری عطاء پر قناعت کرے)

اس دعاء میں نبی کریم ﷺ نے نفس مطمئنہ کی تین صفتوں میں سے ایک صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ اللہ سے ملاقات کا یقین رکھتا ہو، معلوم ہوا کہ جو آدمی اللہ تعالی سے ملاقات کا پکا یقین نہیں رکھتا، اسے نفس مطمئنہ حاصل نہیں ہے۔ یقین کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک پکا یقین اور ایک کچا یقین، کچا یقین تو ہر مؤمن کو حاصل ہے کیونکہ ہر کوئی جانتا ہے کہ ایک دن مرنا ہے، اللہ سے ملاقات کرنا ہے، لیکن ایسا کچا یقین ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا، جیسا تھا ویسا ہی ہے، اسی لئے امام غزالی اپنی کتاب احیاء العلوم میں جہاں آخرت کا بیان ہے، لکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں بھی بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کے دل کے اندر آخرت کا یقین گھس گیا ہو۔ (احیاء العلوم: ۵۱۱/۴)

کچا یقین تو سب کو ہے، لیکن یہاں پکے یقین کا سوال ہے، اس لئے کہ جسے اللہ سے ملاقات کا پکا یقین ہوتا ہے، اس کی زندگی کا نقشہ الگ ہوتا ہے، وہ کبھی حرام کاموں میں مبتلا نہیں ہوگا، وہ کبھی فرائض کو پامال نہیں کرے گا، گناہوں کے قریب بھی نہیں جائے گا، اور پکا یقین اسی وقت تسلیم بھی کیا جائے گا جبکہ وہ اوامر کو بجالاتا ہو، نمازوں کا اہتمام کرتا ہو، اور نواہی وممنوعات سے اپنے آپ کو بچاتا ہو۔ اگر یہ چیزیں اس کی زندگی میں نہ ہوں تو اسے اللہ سے ملاقات کا پکا یقین نہیں ہے، اس لئے کہ آثار ہی سے نظریات وعقائد کا پتہ چلتا ہے، مثال کے طور پر اگر ایک بیٹا اپنے باپ کی نافرمانی کرے تو آپ اس سے کہتے ہیں کہ ارے! وہ تو تمہارا باپ ہے باپ

، یہ اس لڑکے سے کیوں کہتے ہیں، حالانکہ آپ سے زیادہ وہ لڑکا جانتا ہے کہ وہ اس کا باپ ہے، لیکن آثار نہ ہونے کی وجہ سے آپ اس سے کہتے ہیں کہ وہ تمہارا باپ ہے، اس لئے کہ وہ جاننا بھی کیا جاننا جس میں جاننے کے آثار ولوازمات نہ ہوں۔

اسی طریقے پر سمجھئے کہ اللہ سے ملاقات کا پکا یقین ہوگا تو خود بخود زندگی کا نقشہ بدل جائے گا، حلال وحرام کی تمیز پیدا ہو جائے گی، اچھے اور برے کا فرق کرے گا۔

ایک صحابی کا عجیب واقعہ:

الغرض مؤمن کو اللہ سے ملاقات کا ایسا پکا یقین ہوتا ہے کہ وہ آخرت کے مناظر کا دنیا ہی میں مشاہدہ کرتا ہے، جیسے ایک صحابی حضرت عمیر بن الحمام رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے، جب رسول اللہ ﷺ نے جنگ بدر میں مشرکین کو قریب ہوتا دیکھا تو فرمایا کہ اس جنت کی طرف لپکو جس کی چوڑائی زمین وآسمان کے برابر ہے، حضرت عمیر نے کہا کہ ’’بخ بخ‘‘ یعنی واہ واہ، آپ نے پوچھا کہ تم نے واہ واہ کیوں کہا؟ تو عرض کرنے لگے کہ میں بھی ان لوگوں میں داخل ہونے کی امید وآرزو رکھتا ہوں جو اس میں جانے والے ہیں، آپ نے فرمایا کہ تم بھی ان لوگوں میں ہو، پھر وہ اپنی تھیلی سے کھجوریں نکال کر کھانے لگے، پھر کہا کہ : لَئِنْ أَنَا حَيِيتُ حَتّٰى آكُلَ تَمَرَاتِيْ هٰذِهِ إِنَّهَا لَحَيَاةٌ طَوِيلَةٌ ‘‘(اگر میں ان میرے کھجوروں کو کھانے تک زندہ رہوں تو یہ بڑی لمبی زندگی ہے) یہ کہہ کر گئے اور لڑ کر شہید ہوگئے۔ (مسلم: ۱۹۰۱، سنن بیہقی: ۴۳/۹، مسند احمد: ۱۳۶/۳، طبقات ابن سعد: ۴۲۵/۳، الاصابہ: ۵۹۴/۴)

مطلب یہ کہ آخرت کا ایسا یقین تھا کہ کھجوروں کے کھانے تک کا وقت بھی ان کو اس دنیا میں زیادہ اور طویل لگ رہا تھا، اور اس کے مقابلے میں ان کو جنت بالکل سامنے نظر آرہی تھی، گویا کہ وہ آنکھوں سے اسے دیکھ رہے ہوں۔

❁ اللہ سے ملاقات کا یقین رکھنے والوں کا حال:

قرآن کریم میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے: ﴿فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَيَقُولُ هَاؤُمُ اقْرَؤُوا كِتَابِيَهْ إِنِّي ظَنَنتُ أَنِّي مُلَاقٍ حِسَابِيَهْ﴾[الحاقۃ:۲۰] (جس کا نامۂ عمل اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا آو میرا نامہ عمل پڑھ کر دیکھو کیسا ہے، مجھے پہلے ہی سے یقین تھا کہ میں اس حساب و کتاب کے مرحلے میں آکر اپنے پروردگار سے ملاقات کروں گا)

مطلب یہ ہوا کہ مجھے پہلے ہی سے ملاقات کا پکا یقین تھا، اسی لئے میں ویسے اعمال بھی تیار کیا تھا، معلوم ہوا کہ پکا یقین رکھنے والے کے احوال و اعمال بھی اچھے اور خوب ہوتے ہیں۔

عربی زبان میں ''ظن'' کے کئی معنی آتے ہیں، اور یہاں لفظ ''ظن'' بمعنی یقین ہے، اور ایک معنی ظن کے بدگمانی کے بھی آتے ہیں، اور قرآن میں ظن کی مذمت اسی معنی کے لحاظ سے آئی ہے: ﴿إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ﴾ (بعض گمان گناہ بھی ہوتے ہیں) [الحجرات:۱۲]

ظن کو یقین کے معنے میں قرآن کریم میں ایک اور جگہ بھی استعمال کیا گیا ہے:

﴿وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ، الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ [البقرۃ:۴۵]

(اور بلاشبہ وہ (نماز) عام طور پر لوگوں کے لئے بڑی مشکل اور بوجھل چیز ہے مگر خشوع وخضوع والوں کے لئے (بڑی آسان ہے) اور خاشعین وہ لوگ ہیں جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں، اور وہ اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں)

دیکھئے یہاں بھی اللہ سے ملاقات کا یقین رکھنے والوں کو خاشعین کہا گیا ہے، معلوم ہوا کہ جسے یقین ہوتا ہے وہ نمازوں کا اہتمام کرتا ہے، اور نماز میں خشوع وخضوع پیدا کرتا ہے اور جو نمازوں کو خشوع وخضوع سے پڑھنے کا اہتمام نہیں کرتا، گویا وہ اللہ تعالے سے ملاقات کا یقین رکھنے والا نہیں ہے۔

اس آیت کی دو تفسیریں کی گئی ہیں: ایک یہ کہ ملاقات سے مراد نماز میں اللہ سے ملاقات، کیونکہ نماز بھی اللہ تعالی سے ایک ملاقات اور اس سے مناجات ہی ہے، دوسری تفسیر یہ ہے کہ ملاقات سے مراد آخرت میں قیامت کے دن اللہ سے ملاقات۔ میں کہتا ہوں کہ دونوں مراد ہیں، دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، جو لوگ خشوع خضوع والے ہوتے ہیں، انہیں یہ یقین بھی ہوتا ہے کہ ہم نماز پڑھ رہے ہیں تو نماز میں اللہ سے ملاقات ہو رہی ہے، اور اسی کے ساتھ یہ ایمان ویقین تو ہے ہی کہ قیامت میں بھی اللہ سے ملاقات ہونے والی ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں اللہ سے ملاقات کا یقین پیدا کرنے کے لئے نماز سب سے اعظم چیز ہے، اس لئے جسے ابھی ایسا یقین پیدا نہیں ہوا، اسے چاہئے کہ نمازوں کا اہتمام کرلے، وہ یقین خود بخود پیدا ہو جائے گا، اور جب یقین پیدا ہو جائے گا تو وہ ہر کام میں سوچے گا کہ مجھے ایک دن اللہ سے ملنا ہے

، ہر چیز کا جواب دینا ہے، کھانے میں حلال چیزوں کا اہتمام کرے گا، مکان بنائے گا تو سوچے گا کہ ضرورت کے لئے بنا رہا ہوں، اس میں ہمیشہ نہیں رہنا ہے، اس سے پہلے معلوم نہیں یہاں کون تھا، اس کے بعد معلوم نہیں کون رہے گا، میں بھی کبھی اپنے دفتر میں بیٹھ کر سوچتا ہوں کہ معلوم نہیں میرے بعد یہاں کون بیٹھے گا، دنیا میں تو یہی نقشہ ہے۔

دنیا مسافر خانہ ہے، ابراھیم بن ادھم کا واقعہ:

حضرت ابراھیم بن ادھمؒ جو اپنے زمانے میں ایک بڑے بادشاہ تھے، ایک بار ان کا دربار لگا ہوا تھا، سارے ارکان دولت و وزیر لوگ موجود ہیں، اور بہت سارے دوسرے لوگ بھی بیٹھے ہوئے ہیں، اسی دوران ایک آدمی ان کے محل کے اندر آیا اور دربار میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کو دربانوں نے روکنا چاہا تو اس نے کہا کہ میں یہاں اپنا سامان رکھ کر کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ دربانوں نے اس سے کہا کہ تو بے وقوف ہے، پاگل ہے، تجھے معلوم نہیں کہ یہ بادشاہ کا دربار ہے، محل ہے۔ اس نے کہا کہ دربار ہے؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ تو سرائے ہے، مسافر خانہ ہے، اس لئے میں کچھ دیر یہاں رکنا اور آرام کرنا چاہتا ہوں۔ یہ حجت و بحث ہو رہی تھی کہ بادشاہ کی نظر اس پر پڑ گئی، ابراھیم بن ادھم نے حکم دیا کہ کیا بحث ہو رہی ہے، اس کو بلا کر لاؤ۔ اب اس آدمی کو پکڑ کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا اور بتایا گیا کہ یہ آدمی محل میں آرام کرنا چاہتا ہے، اور کہتا ہے کہ یہ سرائے و مسافر خانہ ہے۔ بادشاہ نے اس سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ کیا قصہ ہے؟ تو اس آدمی نے کہا کہ یہ سرائے ہے، اس میں میرا بھی حق ہے، جیسا کہ آپ کا حق ہے، آپ یہاں رہ سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں رہ

سکتا؟ میں مسافر ہوں، آرام کرنا چاہتا ہوں۔

بادشاہ نے کہا کہ یہ سرائے نہیں ہے، مسافر خانہ نہیں ہے، میرا محل ہے، اس آدمی نے بادشاہ سے پوچھا کہ آپ سے پہلے یہاں کون تھا؟ بادشاہ نے کہا کہ میرا باپ تھا، اس آدمی نے پھر پوچھا کہ ان سے پہلے کون تھا؟ بادشاہ نے کہا کہ میرا دادا تھا، اس نے پوچھا کہ اس سے پہلے کون تھا؟ بادشاہ نے کہا کہ میرا پر دادا تھا، یہ تو پیڑی در پیڑی ہمارے خاندان میں حکومت چلی آرہی ہے۔ اس آدمی نے کہا کہ میں یہی تو کہنا چاہتا ہوں کہ کبھی تو یہاں آپ کا پردادا تھا، کبھی آپ کا دادا تھا، کبھی آپ کا باپ تھا، اب آپ ہیں، کل آپ بھی نہیں رہیں گے، کوئی اور اس جگہ آجائے گا، کوئی آتا ہے تو کوئی جاتا ہے، اسی کا نام تو سرائے ہے، مسافر خانہ ہے۔ یہ کہکر وہ آدمی غائب ہوگیا، یہ دراصل اللہ کا فرشتہ تھا، جو بادشاہ کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اب بادشاہ پریشان ہوگیا، اس کی باتوں پر غور کرنے لگا کہ واقعی یہ دنیا ہے، مجھ سے بھی چھوٹ جائے گی، جیسے میرے باپ سے چھوٹ گئی، جیسے میرے دادا سے چھوٹ گئی، سب چھوڑ کر چلے گئے، کیسے کیسے بادشاہ آئے مگر سب چھوڑ کر چلے گئے، ایسے ہی ایک دن میں بھی چھوڑ کر چلا جاوں گا۔ اب جورات ہوئی تو یہ باتیں سوچ سوچ کر بادشاہ کو نیند نہیں آئی، بالآخر یہ فیصلہ کرلیا کہ اس سے پہلے کہ دنیا مجھے چھوڑ دے، مجھے دنیا کو چھوڑ دینا چاہئے، انہوں نے حکومت چھوڑ دی اور حضرت فضیل بن عیاض کی خدمت میں چلے گئے۔

❁ تارک الدنیا بن جاو:

بزرگوں نے کہا ہے کہ ایک ہے ''تارک الدنیا'' ہونا، ایک ہے'' متروک

الدنیا'' ہونا، تارک الدنیا ہونا کمال ہے، متروک الدنیا ہونا کوئی کمال نہیں، متروک الدنیا کا مطلب یہ ہے کہ دنیا خود ہم کو چھوڑ دے، تارک الدنیا یہ ہے کہ ہم دنیا کو لات ماردیں، اگر دنیا ہی ہم سے روٹھ گئی، چھوٹ گئی، جیسے موت آ گئی تو دنیا خود ہم سے چھوٹ جائے گی، ہم لاکھ چاہیں بھی تو دنیا ہمارے پاس نہیں رہے گی، یہ متروک الدنیا ہونا ہے، متروک الدنیا ہونے سے پہلے تارک الدنیا بن جاو، یعنی دنیا کو خود لات ماردو، جیسا کہ ابراھیم بن ادھم نے دنیا کو لات ماردی اور یہی کمال ہے، اس لئے کہ ایک دن تو متروک الدنیا ہر آدمی ہو جائے گا، جب موت آئے گی تو کیا دنیا ہم سے دور نہیں ہو جائے گی؟ دنیا لات مار کر کہے گی چل یہاں سے، یہاں تو رہنے کا بھی تجھے حق نہیں ہے، گڑ جا زمین میں، مٹ جا، اب میں تیری نہیں ہوں، اب میں تیری بیوی کی ہوں، تیرے بچوں کی ہوں، تیرے خاندان کی ہوں۔ اب یہ آدمی کہے کہ میں نے تجھے کتنی محنت سے کمایا تھا، تیرے لئے کیسی کیسی قربانیاں دی تھیں، میں نے تیرے لئے خون پسینا ایک کیا تھا، تو دنیا کہے گی کہ میرا سب کے ساتھ یہی برتاو ہے، میں سب کو اسی طرح لات مارتی ہوں، ہاں کوئی اللہ کا بندہ مجھے لات ماردے تو میں اس کے قدموں میں گر جاتی ہوں اور جو مجھے سر پے بٹھاتے ہیں میں انہیں لات مارتی ہوں، یہ دنیا کا قانون ہے، اس لئے تارک الدنیا بن جاؤ۔

❁ اللہ سے ملاقات کے آداب:

فرمایا کہ ایک آدمی اپنے ایک محبوب سے یا کسی محترم معظم شخصیت سے ملاقات کا ارادہ کرے تو کیا وہ اس بات کا اہتمام نہیں کرے گا کہ اس کا انداز، اس کی حالت،

اس کا طور طریقہ سب کچھ ایسا ہو جو محبوب کو پسند آجائے؟ وہ ضرور اس بات کی کوشش کرے گا کہ میرا ظاہر اور باطن، میرا لباس و پوشاک، میری ہر ادا ایسی ہو جو اُن کو پسند آجائے۔ اس لئے وہ نہائے گا، دھوئے گا، اپنے آپ کو معطر کرے گا، سنوارے گا، بنائے گا، زیب و زینت کی سب چیزیں اختیا کرے گا، ورنہ اگر یوں ہی بے ڈھنگے طریقہ پر ملنے چلا گیا تو ایسا آدمی محبوب کی ملاقات کے قابل نہیں کہلائے گا۔

اسی طریقہ پر اللہ سے ملاقات کا جب مؤمن کو یقین ہو تو اس کی ہر ادا میں اس بات کا لحاظ ہونا چاہئے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ میرے خدا کو پسند آجائے، چلنا، پھرنا، اٹھنا، بیٹھنا، بولنا، اسی طرح میرا لباس و پوشاک، طور و طریقہ، میری نماز، میرا حج، میری زکوۃ، میرا روزہ اور جو کچھ بھی میں کر رہا ہوں وہ اللہ کو پسند آجائے، ایسا نہ ہو کہ اللہ ناراض ہو جائے۔ جب دنیا میں آدمی اپنے فانی اور ادنی قسم کے محبوب سے ملاقات کے لئے اپنے آپ کو اتنا بناتا اور سنوارتا ہے، تو یہ کیسا بندہ ہے جو اپنے محبوب حقیقی اور ہمیشہ باقی رہنے والے خدا سے ملاقات کے لئے کچھ بھی تیاری نہیں کرنا چاہتا، اپنے ظاہر و باطن کو بنانے اور سنوارنے کی فکر نہیں کرتا، یہ کیسا ملاقات کا متمنی ہے جو رات رات بھر سو کے گذارتا ہے، لہٰذا یہ کوشش کریں کہ میرا چہرہ اللہ کو پسند آنے والا ہو، میرا لباس اللہ کو پسند آنے والا ہو، میری ادائیں اللہ کو پسند آنے والی ہوں۔

اللہ کی پسند کیا ہے؟

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں کیا خبر کہ اللہ کو کیا پسند ہے؟ اللہ کو کونسا لباس پسند، کونسا چہرہ پسند، کونسا طور و طریقہ پسند، جب ملاقات ہوگی تب پوچھ لیں گے،

ہمیں کیا معلوم؟

اگر کوئی بے وقوف یہ سوال کرے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسی لئے تو محمد رسول اللہ ﷺ کو اللہ نے بھیجا ہے کہ میرے بندوں کو آپ بتا دیجئے کہ مجھے کیا پسند ہے اور کیا ناپسند، میں کیسے کو پسند کرتا ہوں، کیسے کو پسند نہیں کرتا، لباس میں مجھے کیا پسند، وضع قطع میں کیسی پسند کرتا ہوں، چہرہ کیسا پسند کرتا ہوں، اسی طرح دیکھنے میں مجھے کیا پسند، اور کیا نا پسند، سننے میں مجھے کیا پسند، کیا نا پسند، بولنے میں مجھے کیا پسند، اور کیا نا پسند، چلنے، اٹھنے، بیٹھنے میں مجھے کیا پسند، اور کیا نا پسند، اسی طرح نماز میں کیسی پسند کرتا ہوں، روزہ میں کیسا پسند کرتا ہوں، حج میں کیسا پسند کرتا ہوں، یہی بتانے تو محمد رسول اللہ ﷺ کو دنیا میں بھیجا گیا۔

معلوم ہوا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کرنا مؤمن کے لئے ضروری ہے، اسی لئے قبر میں یہ سوال بھی کیا جائیگا کہ "من هذا الرجل الذی بعث فیکم" (یہ کون آدمی ہیں جن کو تم میں مبعوث کیا گیا) دنیا میں جب آپ کو جانیں گے نہیں تو وہاں کیا بتا سکتے ہیں، اور اللہ کی پسندیدہ چیزوں کا ہمیں علم کیسے ہوگا؟

ایک بزرگ کو اللہ سے ملاقات کی خوشی:

فرمایا کہ جب کوئی اللہ کا بندہ اس طرح دنیا میں آپ ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کر کے اللہ تعالی کی مرضیات و نا مرضیات کو جان کر اس کے مطابق زندگی گذارتا ہے، اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ سے ملاقات کے شوق میں موت کی تمنا کرتا ہے، اور سفر آخرت کا انتظار کرتا ہے، اور ہنستے ہنستے دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔

ہمارے بزرگوں کے بہت سے ایسے واقعات ملتے ہیں، ایک واقعہ یاد آ گیا

کہ بھوپال میں ایک بزرگ حضرت مولانا یعقوب صاحب مجددی گذرے ہیں، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب علیہ الرحمہ ان کی مجلس میں جا کر بیٹھا کرتے تھے، اوران کے ملفوظات بھی جمع فرمائے ہیں، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ جب ان کا انتقال کا وقت آیا تو جمعہ کا دن تھا، صبح کے وقت اٹھ کر جلدی سے انہوں نے غسل کیا، اور عمدہ کپڑے پہنے، بڑے حشاش بشاش نظر آرہے تھے، اور چہرے پر مسکراہٹ ہی مسکراہٹ تھی، لوگوں نے کہا کہ حضرت آپ کا کوئی سفر ہے کیا؟ بہت جلد تیار ہو گئے ہیں، کہا کہ ہاں سفر ہے، لوگ سمجھے کہ کہیں قریب کا سفر ہوگا، لیکن حضرت گئے ہی نہیں، نماز جمعہ کا وقت قریب آنے لگا، تو خادموں سے کہا کہ تکیہ لاؤ، تکیہ لایا گیا، پھر حضرت لیٹ گئے، اور کلمہ پڑھا اور روح قبض ہو گئی، تب لوگوں کو سمجھ میں آیا کہ یہ پوری تیاری دراصل آخرت کے سفر کے لئے تھی، دیکھئے اللہ سے ملاقات کی کیسی خوشی تھی ان کو۔

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کو موت کی تمنا:

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بعض کتابوں میں پڑھا ہے کہ ایک دفعہ آپ بیٹھے ہوئے تھے، ایک صاحب سامنے سے دوڑتے ہوئے جا رہے تھے، حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ نے ان کو ٹھیرا کر پوچھا کہ بھاگ بھاگ کر کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ حضرت بازار جا رہا ہوں، تو حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ارے بھائی! بازار میں کہیں موت بکتی ہو تو ایک عدد میرے لئے خرید کر لانا۔ اللہ اکبر! دیکھئے موت کا کس قدر انتظار لگا ہوا ہے۔

ارے جس ذات سے ملاقات کے لئے اتنی تیاری کیا ہو، کیا وہ اس سے

ملاقات کی خواہش نہیں کرے گا؟ ایک مثال دیتا ہوں کہ کوئی محترم و معظم مہمان آپ کے گھر میں آنے والا تھا، آپ نے اس کے لئے بہترین کھانے پکائے، اپنے گھر کو سجایا، اس کے لئے بیٹھک بنائی، راحت کا انتظام کیا، سب کچھ کیا، یہ سب کچھ کرنے کے بعد کیا آپ کو ہر لمحہ ان کے آنے کا انتظار نہیں ہوگا؟ ضرور ہوگا، اگر عین اس موقعہ پر کوئی آکر خبر دے کہ وہ نہیں آئیں گے، تو آپ کے دل پر اس وقت کیا گذرے گی۔

اسی طریقہ پر جب مؤمن بندہ اپنے آپ کو اللہ کے لئے تیار کرلے گا اور اللہ سے ملاقات کے قابل اپنے آپ کو بنالے گا، تو وہ انتظار کریگا کہ کب آئے گا فرشتہ لے جانے، کب روح قبض ہوگی، اور میں کب اللہ سے ملاقات کروں گا۔

کیا موت کی تمنا کرنا جائز ہے؟

یہاں ایک مسئلہ بھی سمجھ لیجئے کہ موت کی تمنا کرنا دنیا کے مسائل سے تنگ آکر حرام ہے، اور اللہ سے ملاقات کے لئے تمنا کرنا عین مطلوب ہے، اور اولیاء اللہ کی صفت ہے، اسی لئے یہودیوں نے جب یہ کہا: ﴿نَحۡنُ أَبۡنَاءُ اللّٰهِ وَأَحِبَّائُهٗ﴾ [المائدۃ:۱۸] (ہم اللہ کے بیٹے اور رشتہ دار ہیں) تو اللہ نے جواب میں فرمایا کہ اگر واقعی اللہ کے دوست ہو تو: ﴿فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ﴾ [الجمعہ:۶] (اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کرکے دکھاو)

اس لئے کہ بیٹا باپ سے ملنے کی تمنا کرتا ہے، رشتہ دار رشتہ دار سے ملنے کی خواہش کرتا ہے، اگر تم اللہ کے بیٹے ہو، اللہ کے رشتہ دار ہو تو موت کی تمنا کرکے دکھاؤ گے، اللہ نے خود ہی چیلنج کردیا کہ ﴿وَلَا يَتَمَنَّوۡنَهٗۤ اَبَدًا﴾ [الجمعہ:۷] (کہ یہ قیامت کی صبح تک موت کی تمنا نہیں کرسکتے)

چنانچہ دنیا میں آج تک پوری تاریخ میں کوئی یہودی پیدا نہیں ہوا جو قرآن کے اس چیلنج کو چیلنج کردے، کسی نے موت کی تمنا نہیں کی، اس لئے کہ وہ اللہ کے نہ بیٹے تھے، نہ رشتہ دار تھے، نہ اللہ کے دوست ولاڈلے، لیکن اسلام کی تاریخ پڑھئے، شروع سے آخر تک ہزاروں اولیاء اللہ ملیں گے جنہوں نے موت کی تمنا کی ہے۔

قبر میں ساتھ کون آئے گا:

فرمایا کہ قبر میں کون ساتھ آئے گا؟ نہ باپ آئے گا، نہ بیٹا آئے گا، سارے لوگ قبر پر آکر دفن کر کے چلے جائیں گے، دنیا میں بہت چاہنے والے تھے، بہت دوست تھے، لیکن وہاں اپنی دوستی کا اظہار کرتے ہوئے کوئی نہیں کہے گا کہ میرا دوست مر کے قبر میں جا رہا ہے، میں بھی اس کے ساتھ جا کر سوجاؤں گا، بیوی شوہر کے ساتھ نہیں جائے گی، شوہر بیوی کے ساتھ نہیں جائے گا، ماں بہت محبت کرتی تھی، لیکن مرنے کے بعد بچے کو ہاتھ بھی نہیں لگاتی ہے، ڈر کے بھاگ جاتی ہے، اس طرح ماں باپ تک دور ہوجاتے ہیں، کوئی قبر میں ساتھ نہیں آتا، جیسے ایرپورٹ پر بھی ہوتا ہے کہ پہنچانے والے آتے ہیں تو بس وہیں سے رخصت ہوجاتے ہیں، اندر کون جائے گا؟ کوئی نہیں، سب باہر باہر سے رخصت ہوجاتے ہیں، اب اکیلے ہی چلے جانا ہے، اندر جو بھی حالات پیش آجائیں، اس کو سنبھال لینا ہے، اور رخصت ہونے والا بزبان حال یہ شعر پڑھتا ہے ؎

شکریہ اے قبر تک پہنچانے والو! شکریہ
اب اکیلے ہی چلے جائیں گے اس منزل سے ہم

اللہ اکبر! کیا عجیب شعر ہے! قبر میں جانے والا بول رہا ہے، پہنچانے والوں کو،

جو اٹھا کر لائے ہیں، دفن کر چکے ہیں، اب ان سے کہتا ہے کہ اب آگے کسی کے آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کسی کو الاؤ (Allow) نہیں ہے، ہم اکیلے چلے جائیں گے۔

قبر کی آواز:

اس لیے قبر میں جانے کے لیے اپنے آپ کو خود ہی تیار کرنا ہے، کہ تنہا مجھے جانا ہے، اس کے لیے ساری تیاریاں ابھی سے کرنی ہیں۔

ایک حدیث یاد آ گئی کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے نماز کے لئے تشریف لائے تو بعض صحابہ کو دیکھا کہ وہ ہنسی مذاق کر رہے ہیں تو آپ نے ان سے فرمایا کہ اگر تم کثرت کے ساتھ ہاذم اللذات یعنی لذتوں کو ختم کر دینے والی چیز موت کو یاد کرو تو وہ تم کو اس حرکت سے باز رکھے گی۔ پھر فرمایا کہ قبر روزانہ یہ کہتی ہے کہ: میں اجنبیت کا مکان ہوں، میں تنہائی کا مقام ہوں، میں مٹی کا مکان ہوں، میں کیڑوں کا مکان ہوں۔ (ترمذی: ۲۴۶۹)

ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ ایک جنازے میں شریک ہوئے، صحابہ بھی آپ کے ساتھ تھے، آپ قبر کے پاس بیٹھ گئے اور فرمایا کہ قبر روزانہ چیخ چیخ کر کہتی ہے کہ اے ابن آدم! تو نے مجھے کیسے بھلا دیا، کیا تو نہیں جانتا کہ مین تنہائی کا مکان ہوں، اجنبیت کا مکان ہوں، وحشت کا مکان ہوں، کیڑوں کا مکان ہوں اور تنگی کا مکان ہوں۔ (معجم اوسط طبرانی: ۲۷۲/۸)

بزرگو اور بھائیو! اس تنہائی اور وحشت و دہشت کے گھر میں اور کیڑوں، مکوڑوں، سانپوں، بچھوؤں کے گھر میں ایک نہ ایک دن ہمیں جانا ہے، اور وہیں سونا

ہے، معلوم نہیں کہ ہمارے ساتھ کیا کیا پیش آئے گا؟

نظیر آبادی ایک شاعر گزرے ہیں، انہوں نے ایک نقشہ کھینچا ہے ؎

کئی بار ہم نے یہ دیکھا کہ جن کا ☆ مشین بدن تھا، مبیض کفن تھا

جو قبرِ کہن ان کی اکھڑی تو دیکھا ☆ نہ عضو بدن تھا نہ تارِ کفن تھا

کیا عجیب اور جاندار شعر ہے! اللہ اکبر! اس لیے کچھ نہ کچھ موت کی فکر کرو، آخرت کی تیاری کرو، یہی آخرت کی تیاری ہمارے لیے اصل ہے۔

تین بھائیوں کا قصہ:

حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''کہ ایک آدمی کے تین بھائی تھے، ایک بڑا بھائی، ایک درمیانی اور ایک اس سے چھوٹا۔ جب اس شخص کا انتقال ہونے لگا تو اس نے اپنے بڑے بھائی کو بلایا اور کہا کہ آپ میرے بڑے بھائی ہیں اور میری موت کا وقت آ گیا ہے، میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ ساتھ رہیں، میری قبر میں بھی آپ تشریف لائیں، اور مجھ سے کبھی جدا نہ ہوں۔ وہ بڑا بھائی کہہ دے گا کہ میں تو یہ کام نہیں کرسکتا، البتہ اتنا کرسکتا ہوں کہ جب تک تیری جان میں جان ہے، تیرے پاس بیٹھا رہوں گا، لیکن جوں ہی تیری جان نکل جائے گی، پھر میرا اور تیرا کوئی رشتہ نہیں۔

وہ مرنے والا مایوس ہوکر اپنے دوسرے بھائی کو بلائے گا اور کہے گا کہ بھائی دیکھو! آپ بھی میرے بھائی ہیں، آپ کا ہمارا دوستانہ رہا، ہم میں پیار محبت رہی اور ہم ایک دوسرے کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرتے رہے، اب میری موت کا وقت آ گیا ہے، بہتر یہ ہے کہ آپ میرے ساتھ میری قبر میں بھی آ جائیں تاکہ وہاں بھی

ساتھ ساتھ رہیں جیسے یہاں ساتھ ساتھ رہے۔

وہ کہے گا کہ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ میں تیرے ساتھ آ جاؤں، ہاں اتنا کرسکتا ہوں کہ جب تک تیری جان میں جان ہے، تیرے پاس رہوں گا، جان نکل جائے تو تجھے نہلاؤں گا، دھلاؤں گا اور پھر اس کے بعد تجھ کو اٹھا کر لے جاؤں گا، قبر میں تجھ کو پہنچا کر اس کے بعد واپس آ جاؤں گا۔

وہ مایوس ہو کر تیسرے چھوٹے بھائی کو بلا کر کہے گا کہ میں نے تجھے مارا ہے، پیٹا ہے، تجھ پر چھوٹا ہونے کی وجہ سے ظلم بھی کیا ہے، لیکن اب میرا بڑا خراب وقت آ گیا ہے، میں مرنے جا رہا ہوں، میرا کوئی سہارا نہیں، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تو میرے ساتھ ساتھ رہے اور تو میری قبر میں بھی میرے ساتھ آ جائے۔

تو یہ تیسرا بھائی کہے گا کہ ہاں جب تک کہ روح تیری موجود ہے، دم میں دم موجود ہے تب تک بھی میں تیرے ساتھ ہوں، اور جب تو مر جائے گا تو نہلانے دھلانے میں، سب میں شریک رہوں گا، اور جب قبر میں تجھے دفن کیا جائے گا تو وہاں بھی تیرے ساتھ ساتھ آ جاؤں گا۔

حضرت نبی اکرم ﷺ نے یہ سنا کر صحابہؓ سے پوچھا کیا تم کو سمجھ میں آیا کہ یہ تین بھائی کون تھے؟ صحابہ نے کہا: "اللّٰہ ورسولہ اعلم" (اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں)۔ آپ نے فرمایا کہ آدمی کا پہلا بھائی اس سے مال و دولت مراد ہے، جب آدمی اس سے کہے گا کہ میرے ساتھ قبر میں چل، تو مال دولت یہ کہے گی کہ نہیں، نہیں، میں تو تیرے ساتھ نہیں آ سکتی، ہاں جب تک تیری جان میں جان ہے، میں تیری ہوں اور جب جان نکل گئی تو تیرا ہمارا کوئی رشتہ نہیں، روح نکلتے ہی مال تو کسی اور کا ہو جاتا ہے، دوسرے لوگ ہڑپ کرنے کو تیار بیٹھے رہتے ہیں، بلکہ ایسے

واقعات بھی آج کل پیش آرہے ہیں کہ ادھر روح قبض ہوئی اور ادھر مال کے بارے میں جھگڑا شروع ہوگیا کہ مجھے ملے، تجھے ملے، تو یہ بڑا بھائی مال ہے۔

اور فرمایا کہ دوسرے بھائی سے مراد دراصل رشتہ دار ہیں، دوست احباب ہیں، یہ آدمی کے ساتھ اس وقت تک رہتے ہیں، جب تک کہ قبر میں اس کو دفن کیا جاتا ہے، لیکن قبر میں دفن ہوتے ہی سب کے سب واپس آجاتے ہیں۔ اور تیسرا چھوٹا بھائی کون ہے؟ فرمایا کہ تیسرے بھائی سے مراد اس کے اچھے یا برے اعمال ہیں۔ (کتاب الامثال للمحدث رامہرمزی:)

ایک حدیث میں اسی مضمون کو اس طرح مختصر کر کے بیان فرمایا کہ: میت کے ساتھ تین چیزیں جاتی ہیں، دو واپس لوٹ جاتی ہیں اور ایک اسی کے ساتھ باقی رہ جاتی ہے، اس کے اہل وعیال، اس کا مال اور اس کا عمل تین جاتے ہیں، اہل وعیال اور مال واپس چلے آتے ہیں اور عمل اس کے ساتھ رہ جاتا ہے۔ (ترمذی:۲۳۷۹)

الغرض قبر میں صرف اعمال ہی ہمارے ساتھ جائیں گے، اور کوئی چیز ساتھ نہیں جائے گی، اس لیے قبر کے حالات ہمیشہ ہمارے سامنے ہونا چاہیے۔

❁ موت کا مراقبہ ہونا چاہیے:

اس لئے روزانہ تھوڑی دیر کے لیے موت کا مراقبہ کیا جائے، مراقبہ کس طرح کریں؟ علماء نے لکھا ہے کہ مراقبہ اس طرح کرو کہ دس منٹ یا پندرہ منٹ کے لیے بیٹھ جاؤ سکون کے ساتھ اور خیال کرو کہ میں مر گیا ہوں، میری روح نکل چکی ہے، اور مجھے لٹایا گیا ہے، سارے رشتہ دار میرے ارد گرد جمع ہو گئے ہیں، رونے والے رو رہے ہیں، ہنسنے والے ہنس رہے ہیں، میری موت پر خوشی منانے والے خوشی

منا رہے ہیں، بہت سوں کو دکھ و درد ہو رہا ہے تو وہ چیخ پکار کر رہے ہیں، اور پھر مجھے نہلانے کو لے جایا جارہا ہے، میرے کپڑے اتارے جارہے ہیں، کفن پہنایا جارہا ہے، جنازہ کی نماز پڑھی جاری ہے، میرا جنازہ اٹھا کر لوگ مجھے قبرستان لے جا رہے ہیں، پھر مجھے تن تنہا اندھیری قبر میں اُتار کر واپس چلے جارہے ہیں، پھر قبر میں سوال ہو رہا ہے، پھر اللہ کے حضور میں پیشی ہو رہی ہے، حساب و کتاب ہو رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب ہوتا ہے کہ نہیں ہوتا؟ جی ہاں! یہ سب کچھ ہوتا ہے، اس کا مراقبہ کرتے رہنا چاہئے۔

فرمایا کہ ان چیزوں کا مراقبہ آدمی روزانہ کرے، یا کم از کم دو چار دن کے بعد کرتا رہے، مگر بہت سارے لوگ موت کا مراقبہ کرنے سے ڈرتے ہیں، موت کے مراقبے سے کیا ڈر ہے؟ اس سے موت کی فکر، موت کی یاد پیدا ہو جائے گی اور آدمی اپنے آپ کو سنبھالنے، بنانے اور سدھارنے میں آسانی محسوس کرے گا، اور انشاء اللہ آدمی کے اندر ایک انقلاب پیدا ہو جائیگا اور وہ اپنی آخرت کی فکر و تیاری کرنے لگے گا۔

عقل مند کی پہچان:

اور یہی دراصل آدمی کے عقل مند ہونے کی نشانی و پہچان ہے، لوگ عقل مند اس کو سمجھتے ہیں جو دنیا کی فکر میں لگا رہے اور خوب کمائے اور خوب کھائے، حلال و حرام کی کوئی تمیز کے بغیر مال و دولت جمع کرے، لیکن آیئے میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اسلام نے عقل مند کس کو کہا ہے؟

حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ ایک انصاری صحابی حاضر ہوئے، سلام پیش کیا اور

عرض کیا کہ یارسول اللہ! أيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ أَفْضَلُ؟ (مؤمنین میں سب سے افضل کون ہے؟) آپ نے فرمایا کہ " أَحْسَنُهُمْ خُلُقاً "(جو اخلاق میں سب سے اچھا ہو) انہوں نے پوچھا کہ " أَيُّ الْمُسْلِمِيْنَ أَكْيَسُ ؟"(کون مسلمان سب سے زیادہ عقل مند ہے) آپ نے فرمایا کہ :" أَكْثَرُهُمْ لِلْمَوْتِ ذِكْراً وَ أَحْسَنُهُمْ لِمَا بَعْدَهُمْ اسْتِعْدَاداً ، أُوْلَئِكَ الْأَكْيَاسُ "(ان میں سے جو لوگ سب سے زیادہ موت کو یاد کرتے ہیں اور بعد کی زندگی کے لئے سب سے اچھی تیاری کرنے والے ہیں، یہی لوگ عقل مند ہیں) (ابن ماجہ: ۴۲۵۹، مستدرک: ۵۸۲/۴، تذکرہ للامام قرطبی: ۸/۱)

معلوم ہوا کہ اصل میں عقل مند وہی ہے جو موت کو یاد کرتا ہو اور موت کے بعد کی زندگی کے لئے تیاری کرتا ہو۔

دنیا جمع کرنے والا بے عقل ہے:

اور اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ صرف دنیا کے پیچھے پڑنے والا اور اسی کی دھن وخیال میں رہنے والا اور اس کو جمع کر کر کے دنیا ہی کے لئے رکھنے والا بے وقوف و بے عقل ہے، اگر چہ کہ لوگ اس کو بڑا عقل مند سمجھتے ہیں، چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ :" اَلدُّنْيَا دَارُ مَنْ لَا دَارَ لَهٗ وَ مَالُ مَنْ لَا مَالَ لَهٗ وَ يَجْمَعُ لَهٗ مَنْ لَا عَقْلَ لَهٗ "(دنیا اس کا گھر ہے جس کا کوئی اور گھر نہ ہو، اور اس کا مال ہے جس کا کوئی اور مال نہ ہو اور اس کے لئے وہی جمع کرتا ہے جس کو عقل نہ ہو)۔(مشکاۃ المصابیح: ۵۲۱۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص صرف دنیا کی خاطر دنیا کو جمع کرتا ہے وہ بے

عقل ہے، بے وقوف ہے، کیونکہ اس کو یہیں چھوڑ کر جب جانا ہے تو اس کی خاطر کیوں جمع کرتا ہے، ہاں! کوئی دنیا کو آخرت کے لئے جمع کرتا ہے تو یہ عقل مند ہے، مثلاً دنیا کو جمع کرتا ہے تاکہ اللہ کے راستے میں خرچ کروں گا، مسکین و بیواؤں کو، بے کس محتاج لوگوں کی امداد کر کے اللہ کی خوشنودی حاصل کروں گا تو یہ شخص بڑا عقل مند ہے کہ دنیا کو آخرت کا وسیلہ بنالیا ہے۔

حساب یسیر کی تفسیر:

معلوم نہیں کہ وہاں ہمارا حساب کیسا ہوگا، آسان یا مشکل؟ کیا اس کٹھن مرحلے کو سوچ کر اس کی فکر نہیں ہونا چاہئے؟ اور کیا یہ خبر بھی ہے کہ آسان حساب کیا ہے اور مشکل کیا؟ قرآن کریم میں ایک آیت ہے جس میں آسان حساب کا ذکر ہے:

﴿فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَاباً يَّسِيراً﴾ [الانشقاق:۸] (وہ شخص جس کے نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دئے جائیں تو اس کا آسان حساب لیا جائے گا)

اس آیت کے متعلق ایک دفعہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا، یارسول اللہ! آسان حساب کا مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ بعض لوگوں کا حساب آسان ہوگا، بعض لوگوں کا حساب مشکل ہوگا۔ تو اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا "لَيْسَ أَحَدٌ يُحَاسَبُ إِلَّا هَلَكَ" (جس سے بھی سوال کیا جائے گا اس کی ہلاکت ہے)۔ (بخاری: ۴۶۵۵)

یعنی یہاں حساب یسیر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سوال ہی نہ کرے، اور جنت کو بھیج دے، یہ حساب یسیر ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ پوچھ لے کہ تم نے یہ کیوں کیا، یہ کیوں نہیں

کیا تو بس پوچھ لینا ہی دراصل پکڑ لینا ہے، سوال کر لینا ہی اس کی ہلاکت ہے، اس لیے کہ اللہ سوال کرے اور بندہ اس کا جواب دیدے، یہ ممکن ہی نہیں ہے۔

ارے بھائی! دنیا میں جب ہم کسی بادشاہ کو جواب نہیں دے سکتے، کسی پڑھے لکھے عقلمند کے پاس آپ پہنچ جائیں اور وہ سوالات کرنے لگے، کوئی بڑا جج سوال کرنے لگے تو اس کے سوالات کا جواب ہم نہ دے پائیں، تو پھر اللہ کو کون جواب دے سکتا ہے، جو احکم الحاکمین ہے، جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے؟ کسی سے اللہ تعالیٰ پوچھ لیں تو سمجھ لو کہ جائے گا جہنم میں، اور بغیر پوچھے چھوڑ دیں تو سمجھ جاؤ کہ یہ بچ گیا۔

موت کو یاد کرنے کا فائدہ وفضیلت:

الغرض موت کی یاد اور آخرت جس کے لئے ہم بنائے گئے ہیں اس کی تیاری ضروری ہے، اور آخرت کی فکر موت کی یاد سے پیدا ہوگی، اسی لئے موت کو یاد کرنے کی فضیلت بھی آئی ہے اور اس کا فائدہ بھی بتایا گیا ہے۔

امام قرطبی نے اپنی کتاب ''تذکرہ'' میں یہ حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "کَفٰی بِالْمَوْتِ وَاعِظاً " (نصیحت کے لئے موت ہی کافی ہے) اور ایک حدیث میں فرمایا کہ :" أَکْثِرُوْا ذِکْرَ الْمَوْتِ فَإِنَّہٗ یُمَحِّصُ الذُّنُوْبَ وَ یُزَھِّدُ فِي الدُّنْیَا"(موت کو کثرت کے ساتھ یاد کرو، کیونکہ وہ گناہوں کو پاک کرتا اور دنیا سے بے نیاز کرتا ہے)۔(تذکرہ للقرطبی: ۱/۸)

اس سے موت کو یاد کرنے کا بڑا عظیم فائدہ معلوم ہوتا ہے کہ موت کی یاد آدمی کو گناہوں سے بچاتی ہے، آدمی سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ جب مجھے مرنا ہے تو خدا کے حضور بھی پیش ہونا ہے اور گناہ کروں گا تو اس کا جواب بھی دینا پڑے گا، میں کیا جواب

دوں گا؟ یہ سوچ کر وہ گناہ چھوڑ دیتا ہے، اور گناہوں کا چھوڑنا اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے، اس طرح موت کی یاد آدمی کو گناہوں سے دور کرتی ہے، اسی لئے اس کو واعظ کہا گیا ہے کہ موت خود ایک بہترین واعظ و نصیحت کرنے والا ہے، آدمی کو کوئی اور نصیحت کرنے والا نہ ہو تو ایک عقل مند آدمی اسی کو یاد کر کر کے نصیحت پکڑ لے گا۔

اور اس میں دوسری بات یہ بتائی کہ موت کی یاد آدمی کو دنیا سے زاہد و بے نیاز بنا دیتی ہے، کیونکہ وہ سوچتا ہے کہ اس دنیا کو ایک نہ ایک دن چھوڑنا ہے اور قبر میں جانا ہے اور آخرت کے مراحل سے گزرنا ہے، میں اس کو لیکر اور پال کر کیا کروں گا؟ لہذا وہ صرف ضرورت کی حد تک اس دنیا سے لیتا ہے اور اس کی حرص میں مبتلا نہیں ہوتا۔ یہ دو فائدہ جو بہت واضح ہیں اللہ کے نبی ﷺ نے موت کی یاد کے بتائے ہیں۔

اور اس کی فضیلت یہ ہے کہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا شہیدوں کے ساتھ کوئی اُٹھایا جائے گا؟ یعنی قیامت میں ان کے ساتھ کسی کو محشور کیا جائے گا؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں! جو آدمی رات دن میں بیس مرتبہ موت کو یاد کرے گا اس کو ان کے ساتھ اُٹھایا جائے گا۔ (تذکرہ:۱/۸)

میرے بھائیو! کس قدر بڑی فضیلت ہے اس کی جو موت کو یاد کرتا ہے کہ اس کو شہیدوں کے ساتھ قیامت میں اُٹھایا جائے گا۔

موت کو یاد کرنے والا شہیدوں کے برابر کیوں؟

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ شہید کا مقام بہت اونچا ہے، کیونکہ وہ اللہ کے راستے میں اپنی جان لٹا دیتا ہے، تو موت کو روزانہ بیس مرتبہ یاد کرنے والے کو اس کے برابر کا درجہ کیوں دیا گیا؟ اس کا جواب میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ جس طرح

شہید اللہ کے لئے اپنی جان دیتا ہے، اسی طرح موت کو یاد کرنے والا اللہ کے لئے اپنے نفس اور نفسانی خواہشات کی قربانی دیتا ہے اور موت کی یاد اس کو گناہوں سے باز رکھتی ہے۔ اور یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے، یہ بھی بہت بڑا کام ہے کہ آدمی اپنے نفس کی اور نفسانی خواہشات ولذات کی قربانی پیش کرے۔ اسی لئے ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ :" اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ " (مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے) (ترمذی:۱۶۲۱، مسند احمد: ۲۴۰۱۱، صحیح ابن حبان: ۴۸۴/۱۰)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اصل مجاہد وہی ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرتا ہے لہٰذا ایک شخص اگر موت کو کثرت سے یاد کرنے کی وجہ سے اپنے نفس کے خلاف مجاہدہ وجہاد کرنے لگا تو یہ واقعی مجاہد ہے اور اللہ کے راستے میں اس نے اپنے نفس کی قربانی دی ہے، اس لئے اس کو قیامت کے دن شہیدوں میں اُٹھایا جائے گا۔

حکیم الامت کا استحضارِ موت کا طریق:

فرمایا کہ حضرت حکیم الامت مجدد ملت مولانا اشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہ بڑے بڑے علماء اور مشائخ کے مرشد تھے، انہوں نے اپنے حجرہ میں دو شعر لکھوا کر دیوار پر لگا رکھے تھے۔ حضرت تھانویؒ کی جو خانقاہ ہے، ان کا کمرہ قبر سے کم نہیں ہے، آج بھی موجود ہے، ایک طرف ان کے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا کمرہ ہے، دوسری طرف ایک اور کمرہ ہے جس میں پہلے حافظ ضامن شہیدؒ رہتے تھے، پھر اس کے بعد حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ رہتے تھے، دونوں کمرے بازو بازو ہیں، اور اتنے چھوٹے اور ایسے اندھیرے ہیں کہ وہاں پر جانے کے بعد قبر تو ضرور یاد آجاتی ہے۔

تو وہ دو شعر پیش کرر ہا ہوں جو حکیم الامتؒ کے حجرے میں آویزاں ہیں اور حضرت اس کو پڑھا کرتے تھے، اس سے ان کے استحضار موت کا پتہ چلتا ہے۔

یہ حضرت مجذوب صاحب کے اشعار ہیں، حضرت خواجہ مجذوب، عزیز الحسن حضرت تھانویؒ کے جلیل القدر خلیفہ گزرے ہیں، بہت بڑے شاعر بھی تھے، ان کے اشعار ہیں ؎

رہ کے دنیا میں بشر کو نہیں زیبا غفلت
موت کا دھیان بھی لازم ہے کہ ہر آن رہے
جو بشر آتا ہے دنیا میں یہ کہتی ہے قضا
میں بھی پیچھے چلی آتی ہوں ذرا دھیان رہے

اب دعاء کیجئے کہ اللہ ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے اور آخرت کی فکر، آخرت کی طلب اور تیاری کا جذبہ، اور اسکے لیے اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے توفیقِ مزید عطا فرمائے۔

باسمہ تعالیٰ

حقیقتِ طہارت

یعنی اسلام میں پاکی صفائی کی حقیقت

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین أما بعد فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: أَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْإِيْمَانِ (طہارت آدھا ایمان ہے) (مسلم: ۲۲۳، مسند احمد: ۲۲۹۵۳، دارمی: ۱/۱۷۴)

یہ حدیث بہت مشہور ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت سے بچوں کو یاد بھی ہوگی، اس حدیث میں حضرت رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ طہارت ایمان کا آدھا حصہ ہے، طہارت کے معنی ہیں پاکی وصفائی۔

حدیث پر ایک اشکال:

اس حدیث پر بظاہر ایک سخت اشکال ہوتا ہے، وہ یہ کہ اس میں ایمان کے ایک جزء طہارت کو ایمان کا شطر کہا گیا ہے، اور عربی میں شطر کے دو معنی ہیں: ایک معنی کسی چیز کا آدھا اور ایک معنی کسی چیز کا ایک جزء، اگر اس کے معنی جزء کے لئے جائیں تب تو کوئی اشکال نہیں کیونکہ طہارت ایمان کا ایک حصہ و جزء تو ہے ہی، اس میں کیا شبہ ہے؟ لیکن اگر اس کے معنی نصف و آدھے کے لئے جائیں تو اشکال ہوگا کہ ایمان کے تو بہت سے شعبے اور ابواب ہیں، اجزاء و حصے ہیں، اور خود حدیث کے مطابق ستر سے اوپر اس کے شعبے ہیں، تو اس حدیث میں صرف طہارت کو نصف ایمان کیسے فرمادیا گیا؟ کیا نماز، روزہ، زکاۃ وحج، اور دیگر تمام امورِ دین ایک طرف اور صرف

طہارت ایک جانب اور ان سب کے برابر؟ یہ بات بظاہر عجیب بھی لگتی ہے اور قابل اشکال بھی معلوم ہوتی ہے۔ مگر جب ہم اسلام میں طہارت کی حقیقت کیا ہے اس کو سمجھ لیں گے تو یہ اشکال ختم ہو جائے گا اور معلوم ہوگا کہ واقعی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ طہارت ایمان کا آدھا حصہ ہے، آج میں اسی کو تفصیل کے ساتھ بیان کروں گا۔

۞ اشکال کا جواب:

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں طہارت سے مراد صرف ظاہری طہارت نہیں ہے بلکہ ظاہری و باطنی تمام قسم کی طہارتیں اس سے مراد ہیں، اسی لئے اس کی تشریح میں علماء نے کہا ہے کہ پاکی اور طہارت چار قسم کی ہوتی ہے۔ ہم لوگ عام طور پر ایک طہارت و پاکی کو جانتے ہیں، تین پاکیوں کو نہیں جانتے، حالانکہ وہ ساری پاکیاں مراد ہیں، جب وہ ساری پاکیاں مل ملا کر ہمارے اندر پیدا ہو جائیں گی تو ہمارا آدھا ایمان مکمل ہو جائے گا اور اگر صرف ایک پاکی ہمارے اندر پیدا ہوئی تو آدھا ایمان مکمل نہیں ہوگا۔ اس طرح اس کو آدھا ایمان قرار دینا ان سب قسموں کے پیش نظر ہے، اس لئے اس میں کوئی اشکال کی بات نہیں ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ چار پاکیاں کیا ہیں؟ اب میں اسی کی تفصیل عرض کروں گا۔

۞ طہارت کی پہلی قسم:

علماء فرماتے ہیں کہ ایک پاکی ظاہری جسم کی یا ظاہری چیزوں کی ہے، جیسے کپڑے پاک ہوں، جگہ پاک ہو، گھر پاک ہو، ایسے ہی ہمارا جسم پاک ہو۔

اسی لیے حکم دیا گیا ہے کہ ہر جمعہ کو غسل کرو، اور اگر اس سے جلدی کریں تو بہت اچھا ہے، روزانہ ہی کریں تو اور اچھا ہے، اور غسل میں بھی اچھی طرح پاکی

حاصل کرنے کا حکم ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَاِنْ کُنْتُمْ جُنُباً فَاطَّهَّرُوْا﴾[المائدۃ:] (اور اگر تم نا پاک ہو تو اچھی طرح پاکی حاصل کرو)''فَاطَّهَّرُوْا'' کا ترجمہ ہے''پوری پوری طرح پاکی حاصل کرو'' اس لئے کہ عربی کا قاعدہ ہے کہ الفاظ بڑھتے ہیں تو معنی بھی بڑھتے ہیں، لہٰذا ''فَاطَّهَّرُوْا'' میں لفظ ''ط'' اور ''ہ'' پر تشدید ہونے کی وجہ سے وہ دو دو لفظ شمار ہونگے، لہٰذا ان دولفظوں کی زیادتی کی وجہ سے یہ معنی پیدا ہوگئے کہ پوری پوری طرح پاکی حاصل کرو، اس میں پورے مبالغہ کے ساتھ دھونے کا حکم دیا جارہا ہے۔

ایسے ہی ہر چیز پاک صاف اور مجلی مصفٰی ہونی چاہئے اور اسی لیے یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ اپنے جسم کے اندر جو زائد بال اُگ آتے ہیں، ہفتہ میں یا پندرہ دن میں یا کم از کم چالیس دن میں ایک مرتبہ ان کی صفائی کر دینا چاہئے، ناخنوں کی پاکی صفائی کا حکم ہے کہ ان کو برابر کاٹتے رہو، حتی کہ براجم (یعنی انگلیوں کے جوڑوں) کی صفائی کا حکم ہے۔

بالوں کو ٹھیک ٹھاک رکھنے کا بھی حکم ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک صحابی کو نبی کریم ﷺ نے دیکھا کہ ان کے بال بکھرے ہوئے، گرد آلود تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ان کے پاس کوئی ایسی چیز (تیل اور کنگھا) نہیں ہے جس سے وہ اپنے بالوں کو ٹھیک ٹھاک کر لیتے؟ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ نے ایک شخص کو دیکھا جن کے کپڑے میلے کچیلے تھے تو فرمایا کہ کیا ان کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے وہ اپنے کپڑوں کو دھو لیتے۔(ابو داؤد: ۴۰۶۲، نسائی: ۵۲۳۶، مسند احمد: ۳/۳۵۷)

اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کپڑوں کی پاکی و صفائی بہت ضروری ہے۔ اور

قرآن میں بھی اللہ تعالی نے فرمایا ہے:﴿ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾[المدثر:۴](اپنے کپڑوں کو پاک رکھا کرو)۔

دیکھئے! قرآن کتنی اہم ترین کتاب ہے،آسمانوں سے نازل ہوئی ہے،لیکن اس عظیم کتاب میں کپڑوں کو پاک رکھنے کا حکم بھی ہے،اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالی نے اپنی بڑائی بیان کرنے کا حکم دیا ہے۔چنانچہ فرمایا:﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾[المدثر:۳](اپنے رب کی بڑائی بیان کرو)

معلوم ہوا کہ رب کی بڑائی بیان کرنے کے لئے کپڑوں کی پاکی وصفائی ضروری ہے،ورنہ پھر غور کیجئے کہ دونوں میں کیا تعلق؟ جب اللہ کے دربار میں حاضری ہو تو خوب پاک صاف ہونا چاہئے۔اسی لئے وضو میں مسواک کرنے کا حکم دیا گیا ہے،تاکہ منھ میں بدبو نہ رہے،اگر منھ میں بدبو رکھ کر اللہ کا نام لے گا تو کیا مزہ آئیگا؟

کتنا سستا سودا ہے:

حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مسواک کے سلسلہ میں فرمایا کہ یہ: ”مَطْهَرَةٌ لِّلْفَمِ وَمَرْضَاةٌ لِّلرَّبِّ“ ہے۔(بخاری:۱۸۳۱)

مسواک کے دو فائدے بتائے: ایک یہ کہ مسواک منھ کو پاک وصاف کرنے والی ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ مسواک رب کو راضی کرنے والی ہے، دیکھئے! مسواک کی کتنی بڑی فضیلت ہے،اس لئے کہ رب کی رضا سے بڑھ کر اور کیا چیز ہوسکتی ہے؟ اگر صرف منھ میں مسواک پھرا کر خدا کی مرضی مل رہی ہو تو آپ بتائیے کہ کتنا سستا سودا ہے اور پھر بھی آدمی غفلت کر رہا ہے۔

میں بار بار سنایا کرتا ہوں کہ کسی بزرگ نے اللہ سے کہا کہ اے اللہ! آپ کی

قیمت کیا ہے؟ اللہ تعالی نے کہا کہ دونوں عالم میری قیمت ہے۔ یہ سن کر ان کو وجد آ گیا، اور کہنے لگے ؎

قیمت خود ہردو عالم گفتہ ☆ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

اے اللہ! آپ نے اپنی قیمت دونوں عالم کو قرار دیا ہے لیکن یہ قیمت آپ کی بہت کم ہے اس لئے اپنی قیمت اور بڑھا دیجئے، یہ تو بڑا سستا سودا ہے، اتنے سستے آپ نہیں ہو سکتے۔

اسی طرح یہ مسواک بھی ایک چھوٹی سی چیز ہے، مگر اس سے آپ اللہ کی رضا حاصل کر سکتے ہیں، اتنی بڑی فضیلت ہونے کے باوجود بہت سارے لوگ مسواک کا اہتمام نہیں کرتے۔

بیڑی سگریٹ سے بچو:

بعض لوگ بیڑی سیگریٹ پینے کے عادی ہوتے ہیں، جس سے منھ میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے، اسی بدبو کے ساتھ مسجد میں آتے ہیں، ایسے لوگ کبھی نماز میں بازو آ کے کھڑے ہو جاتے ہیں تو ان کے منھ کی بدبو کی وجہ سے نماز پڑھنا دشوار ہو جاتا ہے، کتنی غلط بات ہے؟ آج عصر کی نماز میں ایک صاحب میرے بازو نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے، میں سچ کہتا ہوں میرا دل بار بار کہہ رہا تھا کہ میں نماز توڑ کے بھاگ جاؤں، ایسی بدبو آ رہی تھی ان کے پاس اور اس کی وجہ سے مجھے اُبکائی سی آنے لگی، بار بار جی چاہ رہا تھا کہ نماز توڑ کے بھاگ جاؤں۔

اللہ کے نبی ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا کہ: ”مَنْ أَكَلَ الْبَصَلَ وَالثُّوْمَ وَالْكُرَّاثَ فَلَا يَقْرَبَنَّ مَسْجِدَنَا فَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ تَتَأَذّٰى مِمَّا يَتَأَذّٰى

مِنۡهُ بَنُوۡ آدَمَ" ۔(الترغیب والترہیب:۱/۲۲۳)

(جو شخص پیاز لہسن یا کراث (جو ایک قسم کی بدبودار ترکاری ہوتی ہے) کھائے وہ ہماری مسجدوں کے قریب نہ آئے، کیونکہ فرشتے ان چیزوں سے تکلیف محسوس کرتے ہیں جن سے بنی آدم تکلیف محسوس کرتے ہیں)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بیڑی سگریٹ اور اس جیسی بدبودار چیزوں کا استعمال کرنے کے بعد مسجد کو بغیر منہ کی صفائی کے آنا منع ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ بات اذیت ناک ہے اور غیر انسانی کام ہے۔ نیز بیڑی سگریٹ ویسے بھی نقصان دہ ہے اس لئے بھی ان سے بچنا چاہئے۔

❁ شریعت انسان بننا سکھاتی ہے:

ان ساری باتوں سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے جو شریعت پیش کی ہے، اس شریعت کے اندر یہ بھی ہے کہ انسان بنکر رہو، جانور بنکر نہیں رہنا ہے، اس کی تمام تعلیمات ہمیں انسان بناتی ہیں، انسانیت کا سبق دیتی ہیں، لہذا یہ پاکی صفائی کی جتنی تعلیمات ہیں وہ سب انسانیت کی تعلیمات ہیں، آپ نے کبھی دیکھا ہے کہ جنگل کا شیر دانتوں کی صفائی کرتا ہو، برش استعمال کرتا ہو، یا مسواک کرتا ہو، صابون لگاتا ہو، منہ دھوتا ہو، نہیں کیوں؟ اس لئے کہ وہ جانور ہے، اگر انسان بھی ایسا ہی رہے تو اس میں اور جانور میں کیا فرق رہے گا؟

الغرض یہ سب ظاہری پاکی صفائیاں ہیں، اور یہ پاکی کا پہلا اور ایک درجہ ہے، اس کی بھی بڑی ضرورت ہے، بڑی اہمیت ہے اور اس کو تو ہم سب جانتے ہی ہیں۔

❁ مسلمانوں کی پاکی صفائی میں کوتاہی:

مگر اس کو جاننے کے باجود اس میں کوتاہی سب سے زیادہ مسلمان کرتے ہیں،

جن کے نبی کی شریعت میں پا کی وصفائی کی اس قدر اہمیت وضرورت بیان کی گئی ہے۔

آج اکثر عام مسلمان اور بعض دیندار لوگ بھی پا کی صفائی کی کوئی پرواہ نہیں کرتے، جو باعث شرم بات ہے، اس کے مقابلے میں غیر مسلم لوگوں میں اس کا اہتمام نظر آتا ہے، ان کے محلے ہمارے محلوں کے لحاظ سے صاف ستھرے رہتے ہیں، ان کے مکانات ہمارے مکانات کے مقابلے میں صاف و پاک نظر آتے ہیں، ان کے ہسپتال و ادارے ہمارے اداروں اور ہسپتالوں کے لحاظ سے صاف و پاک دکھائی دیتے ہیں، ان کے کپڑے اور چیزیں ہمارے مقابلے میں زیادہ صاف ستھرے معلوم ہوتے ہیں، حالانکہ معاملہ اس کے خلاف ہونا چاہئے تھا، کہ ہم صفائی و پا کی کا زیادہ اہتمام کرتے، مگر ایسا نہیں ہوتا بلکہ بعض جاہلوں نے تو حد ہی کر رکھی ہے کہ وہ صفائی ستھرائی کے نظام کو غیروں کا طریقہ سمجھتے ہیں اور اس کے اہتمام کو غلط و تکلف خیال کرتے ہیں، یہ دین اسلام سے انتہائی جہالت کی بات ہے۔

اسی قسم کے ایک شخص کا واقعہ سنا تھا کہ ایک نومسلم صاحب جو پہلے انگریز تھے اسلام میں آنے کے بعد نماز کے لئے مسجد آئے تو وہاں دیکھا کہ حوض کی نالی میں کسی نے پان کھا کر اس کی پیک اس طرح تھوکی ہے کہ اس کے اطراف واکناف میں پھیل گئی ہے، ان نومسلم نے یہ دیکھ کر کہا کہ اس کی صفائی کرنا چاہئے، یہ کسی نے غلط کام کیا ہے۔ اس پر وہاں کے مؤذن نے کہا کہ یہ دیکھو، مسلمان تو ہوگیا ہے مگر ابھی تک اس میں سے انگریزیت نہیں گئی۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ، گویا اس بے وقوف کے نزدیک اسلام ایک گندہ مذہب ہے اور انگریزوں کا مذہب صفائی و پا کی کا مذہب ہے۔

بہرحال اسلام میں پا کی وصفائی کی پہلی قسم یہ ہے کہ جسم کی گھر کی کپڑوں کی مکان کی اور دیگر ظاہری چیزوں کی پا کی وصفائی کی جائے۔

طہارت کی دوسری قسم:

اس کے بعد دوسرے نمبر کی پاکی صفائی ہے، وہ کیا ہے؟ امام غزالی لکھتے ہیں: ’’اپنے ظاہری اعضاء کو ظاہری گناہوں سے صاف و پاک کر لینا‘‘، یہ ہے دوسرے قسم کی طہارت۔

ظاہری اعضاء کیا ہیں؟ جیسے آنکھ، کان، ناک، زبان، ہاتھ اور پیر وغیرہ، یہ سب ظاہری اعضاء ہیں، ان ظاہری اعضاء سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو، تب ہمارے یہ اعضاء پاک ہیں، صاف ہیں، اور اگر ان اعضاء سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو وہ اعضاء گناہ گار ہو کر ناپاک ہو جاتے ہیں۔

بہت سے لوگوں کو پاکی صفائی سے اس کا تعلق ہی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا، ہم پاکی صفائی اس کو سمجھتے ہیں کہ اسنو {SNOW} لگا لیا جائے، پوڈر {POWDER} لگایا جائے، عمدہ کپڑے پہن لئے جائیں، بس یہ ہے پاکی و صفائی، لوگ نہا دھو کر یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم پاک ہو گئے، صاف ہو گئے، لیکن زبان سے غلط باتیں بول رہے ہیں، جھوٹ بک رہے ہیں، گالی دے رہے ہیں، اور آنکھیں غلط دیکھ رہی ہیں، حرام و ناجائز چیزوں سے انتفاع کر رہی ہیں، اور کان غلط استعمال کیے جا رہے ہیں، ان سے غیبتیں اور چغلیاں اور جھوٹ سن رہے ہیں، تو ظاہر میں تو یہ آدمی پاک و صاف ہے اور اس کا ظاہر بہت اچھا ہے، مگر آنکھیں اس کی بڑی گندی ہیں، کان ناپاک ہیں، زبان ناپاک ہے، یہ ساری گندگیاں انسان کے اعضاء سے دل کے اندر پہنچتی رہتی ہیں۔

اب بتاؤ! کہ جو آدمی کپڑے تو ماشاء اللہ بہت اچھے پہنا ہوا ہے، اور اسی کے ساتھ استری بھی پڑی ہوئی ہے، اس کے اندر ذرا سی بھی ٹیڑھ نہیں ہے، سب ٹھیک

ٹھاک ہے ،لیکن اسی کے ساتھ ساتھ کان سے غلط چیزیں سن رہا ہے،غیبتیں سن رہاہے، گانے بجانے سن رہاہے، جب گانے سنیں گےتو گندگی پیدا ہوگی۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا"ألغناء ينبت النفاق" (یعنی گانا بجانا نفاق کو پیدا کرتا ہے)(ابوداود:۴۹۲۷)

کتنی سخت بات ہے؟ نفاق کفر کا ہی نام ہے،یعنی کفر جو دل میں چھپا رہتا ہے اس کا نام نفاق ہے ،اور اگر وہ اُگل دیا جائے تو اس کا نام کفر ہے ،اندر رہے تو اس کا نام نفاق ، باہر آجائے تو اس کا نام کفر، چیز ایک ہی ہے صرف اندر اور باہر کا فرق ہے۔ الماری کے اندر رکھیں یا الماری کے باہر رکھیں ، چیز میں کوئی فرق آئے گا؟ نہیں، چیز ایک ہی رہے گی۔

اب ان کانوں کے ذریعہ گندگی اور نفاق دل کے اندر پہنچ رہاہے،اب یہ آدمی لوگوں کی نظر میں بہت پاک صاف ہے،اسی طرح آنکھوں اور ہاتھوں پیروں وغیرہ سے کوئی حرام و ناجائز کام کیا تو وہ انسان ناپاک ہو جاتا ہے،اور اللہ کی نظر میں بڑا گندہ ہو جاتا ہے، کیوں؟اس لیے کہ ظاہری اعضاء گناہوں میں ملوث ہیں۔

انگریزوں کی پاکی کا حال:

انگریزوں کے بارے میں سنا ہوگا کہ انگریز لوگ پاخانہ کر کے دھوتے نہیں، صرف پونچھ لیتے ہیں،لیکن ظاہر میں بڑے اچھے رہتے ہیں، گورے بھی ہوتے ہیں، اور اسی کے ساتھ ساتھ لباس اور پوشاک بھی بہت قیمتی اور اچھا ہوتا ہے،استری ڈال ڈال کر پہنتے ہیں، ظاہر کی صفائی کا بڑا اہتمام کرتے ہیں،مگر اس ظاہری صفائی کے باوجود ناپاک کے ناپاک ہی رہتے ہیں۔

ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی کو گھر صاف کرنا تھا تو اس نے ایک کپڑے

کو پیشاب میں ڈبو کر پورے گھر کو اس کپڑے سے صاف کیا۔ بتاو! گھر پاک ہوا یا مزید ناپاک ہو گیا؟ یہی حال ان انگریزوں کا ہے کہ ظاہر میں تو بہت صاف، لیکن اندر دیکھیں تو بالکل ناپاک۔

اسی طریقہ پر جو آدمی عمدہ و پاک کپڑے پہنتا ہے، جسم اپنا پاک کر لیتا ہے، لیکن اس کے اعضاء گناہوں سے پاک نہیں ہوتے تو وہ اللہ اور اس کے فرشتوں کی نظر میں گندہ رہتا ہے۔

۞ گناہ ایک باطنی نجاست:

یہاں سے ایک بات سمجھ میں آ گئی کہ گناہ فی الواقع ایک باطنی گندگی و نجاست ہے، اس سے انسان گندہ و نجس ہو جاتا ہے، لوگ اس کو ناپاک و نجس نہیں سمجھتے، اس لئے اس سے بچنے کا اہتمام بھی نہیں کرتے، بلکہ گناہ پر گناہ کر کے بھی اپنے کو سب سے زیادہ صاف و پاک خیال کرتے ہیں۔

اب میں قرآن وحدیث سے کچھ دلائل عرض کروں گا، جس سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ گناہ بھی ایک نجاست ہے، اور اس کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ ظاہری اعضاء سے جب گناہوں کا صدور ہو گا تو وہ اعضاء اللہ اور اس کے رسول اور فرشتوں کی نظر میں گندے شمار ہوں گے۔

۞ گناہ نجس ہے-پہلی دلیل:

اب لیجئے پہلی دلیل، قرآن کریم میں آیا ہے: ﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾[سورۃ المائدۃ:۹۰]

(اے ایمان والو! بلاشبہ شراب اور جُوا اور بت (یعنی بتوں کی پرستش جسے کفر کہتے ہیں) اور قسمت جاننے کے لئے جو تیر پھینکے جاتے ہیں، یہ سب ناپا کی اورنجاست ہے، شیطان کے کاموں میں سے ہے، لہٰذا تم اس سے بچو، شاید تم کامیاب ہو جاوگے)

دیکھئے! اس آیت میں اللہ تعالی نے شراب کو، جوے کو، شرک کو، اور قسمت کے تیروں کو ''رِجْسٌ'' (ناپاک) کہا ہے، معلوم ہوا کہ آدمی جب شراب پیتا ہے تو شراب نہیں پیتا، بلکہ گندگی ونجاست پیتا ہے، اسی طرح جب جوا کھیلتا ہے تو اس کے سارے اعضاء میں گندگی لگ جاتی ہے اور جب بتوں کی پرستش کرتا ہے، کافرانہ حرکت کرتا ہے، اس کی وجہ سے بھی اس میں گندگی پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح ''ازلام'' یہ ''زلم'' کی جمع ہے، تیر کو کہتے ہیں، زمانہ جاہلیت میں لوگ تیروں کے ذریعہ فال کھولتے تھے، قسمت جاننے کی کوشش کرتے تھے، یہ ایک خواہ مخواہ کی بات تھی، قسمت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، کوئی کیا بتا سکتا ہے، اس میں اس کو بھی نجاست کہا گیا ہے، لہذا جو لوگ فال کھولتے ہیں یہ بھی گندگی وناپا کی سے ملوث ہوتے ہیں۔

اب یہ سب ظاہری اعضاء سے ہونے والے گناہ ہیں، کوئی ہاتھ سے، کوئی منھ سے، کوئی دیگر اعضاء سے، اللہ نے ان کو رجس اور گندگی فرمایا، ان ظاہری اعضاء سے رجس وگندگی کو جب آدمی پاک کریگا تو طاہر بنے گا، یعنی جب ان گناہوں کو چھوڑے گا تب وہ پاک ہوگا، معلوم ہوا کہ گناہ گندگی کا نجاست کا نام ہے۔

دوسری دلیل:

دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالی نے قرآن میں نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کو چند احکام دئے ہیں: ایک گھروں میں رہنے کا، ایک جاہلی انداز سے بے حیائی و

بے پردگی سے بچنے کا، ایک نماز کو قائم کرنے کا اور ایک زکاۃ دینے کا، پھر فرمایا کہ "إِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا" [الاحزاب:۳۳] (یہ احکام اس لئے دئے گئے کہ اللہ تعالی چاہتے ہیں کہ تم اہل بیت سے گندگی کو دور کردے اور تم کو پاک کردے)

غور کیجئے کہ اس میں چند احکام دینے کے بعد اللہ تعالی ان احکام کو لاگو کرنے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ تم کو اللہ تعالی گندگی سے پاک کرنا چاہتے ہیں، یہ کیا گندگی تھی، کوئی ظاہری گندگی یا باطنی؟ ظاہر ہے کہ یہاں گندگی سے مراد ان احکام کے بجانہ لانے کی صورت میں گناہوں کی وجہ سے جو گندگی پیدا ہوتی ہے اس سے پاک و صاف کرنا مراد ہے، معلوم ہوا کہ گناہ و معصیت ایک نجاست و گندگی ہے۔

❁ تیسری دلیل

تیسری دلیل یہ ہے کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: " إِذَا كَذَبَ الْعَبْدُ تَبَاعَدَ عَنْهُ الْمَلَكُ مِيلاً مِنْ نَتْنِ مَاجَاءَ بِهِ" (جب آدمی جھوٹ بولتا ہے تو اللہ کے فرشتے جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے اس سے بہت دور بھاگ جاتے ہیں) (مشکوۃ:۴۱۳)

کیوں بھاگ جاتے ہیں؟ اس کا جواب خود حدیث دے رہی ہے کہ اس جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے وہ اللہ کے فرشتے اس سے دور ہو جاتے ہیں۔

اب بتاؤ! کہ بدبو گندی چیز سے نکلتی ہے یا اچھی و پاک چیز سے نکلتی ہے؟ ناپاک و گندی چیز سے نکلتی ہے، معلوم ہوا کہ جھوٹ ایک گندگی ہے اور اس گندگی سے ایک بدبو بھی پیدا ہوتی ہے اور وہ اتنی خطرناک ہوتی ہے کہ اللہ کے فرشتے آدمی سے دور بھاگ جاتے ہیں۔

حدیث کی عجیب منطقانہ تشریح:

بھائیو! یہاں اس کی ذراسی تشریح کردوں، دنیا میں دوقسم کی چیزیں ہیں: ایک کو جوہر کہتے ہیں اور ایک کو عرض، مثلاً کتاب جوہر ہے اور اس پر جو رنگ چڑھا ہوا ہے وہ عرض ہے، عرض کہتے ہیں اس چیز کو جو کسی کے تابع بن کر پایا جاتا ہے، بذات خود مستقل طور پر وہ نہیں پایا جاتا، اور جوہر وہ ہے جو بذات خود پایا جاتا ہے، مثلاً رنگ چونکہ وہ عرض ہے اس لئے وہ خود کہیں نہیں پایا جاتا، بلکہ کسی جوہر کے تابع بن کر پایا جاتا ہے، جیسے کسی کتاب پر ہوگا، کسی دیوار پر ہوگا، کسی کپڑے پر ہوگا، کسی المار پر ہوگا، جوہر سے الگ صرف رنگ کا وجود کہیں ہوسکتا ہے؟ نہیں ہوسکتا، اسی طرح انسانوں میں بھی مختلف رنگ ہوتے ہیں، کوئی کالا ہوتا ہے، کوئی گورا ہوتا ہے، کوئی لال ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے رنگتیں الگ الگ بنائیں ہیں، یہ رنگ انسان کے جسم پر پایا جاتا ہے، الگ سے کہیں نہیں مل سکتا۔

جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب یہ سمجھئے کہ اسی طرح بدبو اور خوشبو بھی عرض ہیں، اور یہ بھی کسی نہ کسی جوہر کے تابع بن کر پائے جائیں گے، الگ سے نہیں، مثلاً پاخانہ رکھا ہوا ہے اس سے بدبو آرہی ہے، عطر رکھا ہوا ہے، اس سے خوشبو آرہی ہے، اگر کوئی نجاست نہ ہو تو بدبو کے آنے کا کوئی سوال نہیں، اور اگر کوئی خوشبودار چیز نہ ہو تو خوشبو کے پائے جانے کا کوئی سوال نہیں، نجاست نہ ہو اور بدبو آجائے، کیسے ہوسکے گا؟ عطر نہ ہو خوشبو آجائے، کیسے ہوسکے گا؟ ممکن نہیں۔

اب حدیث کو سمجھئے کہ اللہ کے نبی ﷺ فرمارہے ہیں کہ: ''جب آدمی جھوٹ بولتا ہے تو اللہ کے فرشتے جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے اس سے بہت دور بھاگ جاتے ہیں'' دیکھئے! جھوٹ کی وجہ سے بدبو آرہی ہے اور بدبو عرض ہے، وہ خود نہیں پائی

جاسکتی، اس کے وجود کے لئے جوہر کی ضرورت ہے، لہذا بدبوآنے کے لئے بدبودار چیز وجوہر کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ جب تک بدبودار چیز نہ ہو، بدبونہیں آسکتی، جیسے خوشبودار چیز نہ ہوتو خوشبونہیں آسکتی، اور جب تک کتاب یا اور کوئی جوہر نہ ہوتو رنگت نہیں مل سکتی۔

معلوم ہوا کہ جب آدمی جھوٹ بولتا ہے تو پہلے نجاست اس کے منھ میں پیدا ہو جاتی ہے، پھر اس سے بدبوآتی ہے، وہ بدبو جب اللہ کے فرشتے سونگھتے ہیں تو بھاگ جاتے ہیں، یہ نکتہ ہے جس کو میں سمجھانا چاہتا ہوں۔

معلوم ہوا کہ جھوٹ ایک نجاست ہے، گندگی ہے، لیکن ہم لوگ اس جھوٹ کو نجاستوں میں شمار نہیں کرتے۔ اسی طرح قیاس کیجئے تمام گناہوں کو، آدمی جو بھی گناہ کرتا ہے وہ سب گندگیاں اور نجاستیں ہیں۔

❁ چوتھی دلیل:

گناہ کے نجاست ہونے کی تیسری دلیل یہ ہے کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضرت صفیہ جو آپ ﷺ کی زوجۂ مطہرہ ہیں، ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ کے سامنے فرمایا کہ وہ ایسی ہیں، یہ کہکر انگوٹھے سے اشارہ کیا (یعنی وہ پست قد ہیں) تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ ''عائشہ تونے جوان کی غیبت کی ہے، وہ ایسی گندی ہے کہ اس گندگی کو سمندر میں بھی ڈالدو تو سمندر بھی گندا ہو جائے۔ (ترمذی:۲۵۰۲، ابوداؤد:۴۸۷۵، مسند احمد:۱۸۹/۶)

اب یہاں دیکھئے کہ غیبت کو حضور اقدس ﷺ نجاست ٹھہرا رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ غیبت بھی نجاست ہے اور گندگی کا نام ہے۔

تو ان دلیلوں سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی

نظر میں گناہ ناپاکی ونجاست کا نام ہے۔ ہم اگر ظاہری اعضاء سے ظاہری گناہوں کو پاک وصاف نہ کریں تو ہم نہا کر، دھوکر، خوشبو لگا کر، ظاہری اعتبار سے معطر ہونے کے باوجود اللہ اور اس کے رسول اور فرشتوں کی نظر میں گندے شمار کئے جائیں گے۔

معلوم ہوا کہ ظاہری اعضاء سے ظاہری گناہوں کو صاف و پاک کرنا دوسرے نمبر کی طہارت ہے۔

ظاہری گناہوں سے کیسے بچیں؟

اس طہارت کو حاصل کرنے کی بھی اسی طرح ضرورت ہے جس طرح پہلی طہارت کی ضرورت ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ ضرورت ہے۔

قرآن میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿ وَذَرُوْا ظٰهِرَ الْإِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ﴾ [**الأنعام:**] (ظاہری اور باطنی دونوں قسم کے گناہ چھوڑ دو، بے شبہ جو لوگ گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں ان کو ان کے کئے کا بدلہ عنقریب دیا جائے گا)

بھائیو! اس آیت میں ظاہری و باطنی دونوں قسم کے گناہوں کو چھوڑ دینے کا حکم سنایا گیا ہے، لہذا ان سے پرہیز کرنا چاہئے، اور ان کی گندگی سے بچنا چاہئے۔

مگر ان سے کیسے بچیں؟ انسان جب گناہ کا عادی ہو جاتا ہے تو اس سے اس کا چھوٹنا مشکل ہو جاتا ہے، وہ بار بار کوشش کرتا ہے مگر اس سے بچنے میں کامیاب نہیں ہوتا، اس لئے پریشان ہو جاتا ہے، مگر میں آپ کو بتاتا ہوں کہ گناہوں سے بچنے کے لئے اور ان کی عادت نکالنے کے لئے کچھ تدبیریں اختیار کرنا پڑتا ہے، اور اس کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

پہلی تدبیر-عزم وہمت:

ان تدبیروں میں سے ایک یہ ہے کہ اپنے اندر ترکِ گناہ کی ہمت اور اس کا عزم پیدا کرے، کیونکہ دین ودنیا کا کوئی بھی کام عزم وہمت کے بغیر پورا نہیں ہوتا، معمولی سے معمولی کام بھی عزم وہمت پر موقوف ہے، آپ کھانا کھانا چاہتے ہیں تو اس کے لئے بھی ہمت چاہئے، ورنہ آدمی کھانا بھی کھانے سے رہ جاتا ہے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ ''ہمت مرداں مدد خدا' یعنی جب مرد لوگ ہمت کرتے ہیں تو اللہ کی مدد آتی ہے اور ان کا کام بنا دیا جاتا ہے، اسلئے یہ ہرگز نہ سوچئے کہ میں گناہ نہیں چھوڑ سکوں گا، یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا، بلکہ ہمت کر کے یہ عزم کر لیجئے کہ میں ضرور گناہ پر قابو پالوں گا، ان شاء اللہ ایک نہ ایک دن آپ اس میں کامیاب ہو جائیں گے۔

دوسری تدبیر-توفیق کی دعاء

دوسری تدبیر یہ ہے کہ اللہ تعالی سے گناہ چھوڑنے کی توفیق مانگے، کیونکہ اللہ کی توفیق ہی سے ہم اس میں کامیاب ہو سکتے ہیں، اگر وہاں سے توفیق نہ ملی تو کچھ نہ ہو سکے گا، اس لئے اس کا اہتمام کرنا چاہئے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی دعاؤں میں گناہ سے بچنے کی توفیق کا بھی سوال کرتے تھے۔

ایک دعاء آپ کی یاد آئی کہ آپ نے فرمایا: " اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْئَلُكَ فِعَلَ الْخَيْرَاتِ وَ تَرْكَ الْمُنْكَرَاتِ وَحُبَّ الْمَسَاكِيْنِ الخ (اے اللہ! میں تجھ سے نیک کاموں کے کرنے کی اور برے کاموں کو چھوڑنے کی اور مساکین سے محبت رکھنے کی توفیق مانگتا ہوں)

ایک اور لمبی دعاء میں یہ فرمایا ہے کہ :"اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْئَلُكَ رَحْمَةً مِّنْ

عِنْدِكَ تَعْصِمُنِيْ بِهَا مِنْ كُلِّ سُوْءٍ "(اے اللہ! میں تجھ سے تیری خاص رحمت مانگتا ہوں جس سے تو مجھے ہر برائی یا ہر گناہ سے محفوظ فرمادے)

ان دعاؤں میں اللہ کے رسول ﷺ نے اللہ تعالی سے ترک گناہ کے لئے اس کی توفیق کا سوال کیا ہے، اسی طرح ہمیں بھی اللہ تعالی سے گڑگڑا کر مانگنا چاہئے کہ اے اللہ! تیری ہی توفیق سے ہم گناہ سے بچ سکتے ہیں، اس لئے تو ہی توفیق عطاء فرما۔

تیسری تدبیر-صحبت کاملین:

ایک اہم تدبیر یہ ہے کہ اللہ والوں کی صحبت اختیار کی جائے، یہ کیمیا ہے اور انتہائی مجرب نسخہ، کیونکہ صحبت کی تاثیر تو ایک مسلم حقیقت ہے، اس سے تو کوئی انکار ہی نہیں کرسکتا اور اہل اللہ کی صحبت میں تاثیر بھی زبردست ہوتی ہے، شرابی کبابی اور بڑے بڑے بدمعاش ان کی صحبت سے بڑے بڑے اولیاء اللہ بن گئے ہیں، یہ کوئی فرضی بات نہیں، بلکہ ایک مشاہداتی چیز ہے، جس کا لوگوں نے بارہا تجربہ کیا ہے۔لہذا گناہ سے بچنا ہو تو اس کو بھی ایک تدبیر کے طور پر اختیار کرو اور دیکھو کہ کیا اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔

اور ان کی صحبت کا مؤثر ہونا اس طرح بھی ہوتا ہے کہ ان سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ہم کس طرح گناہوں کو چھوڑ سکتے ہیں، اس کی کیا تدبیر ہے؟ پھر اس پر عمل کرنے سے ان شاء اللہ فائدہ ہوگا۔

حضرت حکیم الامت کی انوکھی تدبیر اصلاح:

اس پر مجھے ایک بات یاد آگئی، اس کو بھی سن لیجئے، حضرت تھانوی کے ایک مرید تھے، انہوں نے ایک دفعہ آپ کو خط لکھا کہ میری آنکھیں بے اختیار غلط چیز یعنی

نامحرموں کی طرف اٹھ جاتی ہیں، لہذا کوئی علاج بتائیں۔ حضرت تھانوی نے جواب لکھا کہ اگر بے اختیار اٹھ جاتی ہیں تو آپ کو فکر کی کیا ضرورت ہے، آپ پریشان کیوں ہیں؟ اٹھنے دیجیے، کیونکہ غیر اختیاری کام پر کوئی گناہ لازم نہیں آتا۔

اس جواب سے ان کو احساس ہوا کہ میں نے غلط بیانی کی ہے، بے اختیار آنکھیں نہیں اُٹھتیں بلکہ اختیار سے ہی اُٹھتی ہیں، لہذا دوسرا خط لکھا کہ حضرت! بے اختیار تو نہیں، اختیار سے ہی اٹھتی ہیں، لیکن نگاہ اٹھنے کے بعد نیچی کرنے کی طاقت نہیں پاتا۔ اس کا جواب حضرت نے لکھا کہ یہ بات بھی تمہاری غلط ہے، اس لیے کہ فلسفہ کا یہ مانا ہوا اصول ہے کہ کسی بھی چیز کا اختیار دونوں طرف سے متعلق ہوتا ہے، طرفین سے متعلق ہوتا ہے، یعنی آدمی اگر کوئی کام کرسکتا ہے تو وہ اس کام کو نہ کرنے کی بھی طاقت رکھتا ہے، ایسا نہیں کہ کر تو سکے، لیکن نہ کرنے کی طاقت نہ رہے، ایسا نہیں ہوسکتا، میں یہ چیز اٹھا رہا ہوں، اگر چاہوں تو نہ اٹھاؤں، دونوں باتیں اختیار میں ہوتی ہیں، یہ کیسے کہ نگاہ اٹھ تو گئی، اب نیچی نہیں کرسکتا۔

اس پر ان صاحب کو پھر اپنی غلطی کا احساس ہوا اور تیسرا خط حضرت کو لکھا، اس میں انہوں نے لکھا کہ حضرت! معافی چاہتا ہوں، پھر غلطی ہوئی، نگاہ کو بچانے کی طاقت تو ہوتی ہے، لیکن ہمت نہیں ہوتی ہے۔

حضرت نے کہا کہ ہاں یہ صحیح ہے، بہت سے لوگوں کو طاقت تو ہوتی ہے، لیکن ہمت نہیں کرتے اور ہمت ہی سے تو سب کچھ ہوتا ہے، آدمی ہمت کرے تو پہاڑ کو ریزہ ریزہ کردے، اگر آدمی کوشش کرے اور ہمت کرے تو معلوم نہیں کہاں سے کہاں پہنچ جائے، یہ ہمت ہی تو ہے کہ آج پوری دنیا کہاں سے کہاں پہونچی ہوئی ہے، اگر ہمت نہ کرتے تو یہ دنیا یہاں تک کیسے پہنچتی، اور اس کے اندر اتنی تبدیلی

کہاں سے آتی، تو ہمت سے بہت کچھ ہوتا ہے۔

الغرض حضرت نے ان کو لکھا کہ آپ کی اصل بیماری ہمت میں کمی ہے، اچھا ٹھیک ہے، لیکن یہ فرمائیے کہ اگر میں بھی اس وقت تمہارے ساتھ ساتھ چل رہا ہوں تب بھی ایسا ہی ہوگا؟ کہ غیر محرموں کو دیکھتے رہو گے اور یہ کہو گے کہ بچنے کی ہمت نہیں ہوتی، نگاہ نیچے کرنے کی ہمت نہیں ہوتی؟

اس پر ان صاحب کا خط آیا کہ حضرت !اگر آپ ساتھ ہوں تو ایسا نہیں ہوگا، بلکہ پھر تو نگاہیں نیچی ہو جائیں گی۔ پھر حضرت نے ان کو جواب لکھا کہ جب میرے ساتھ ہونے کے خیال سے تمہاری نگاہیں نیچی ہوسکتی ہیں، تو خالق دو جہاں کے ساتھ ہونے کے تصور سے نگاہ کیوں نیچی نہیں ہوسکتی؟

یہ ہے اصلاح کا طریقہ، عجیب وغریب طریقہ سے اصلاح ہوتی ہے، اگرچہ کئی کئی خطوط کا تبادلہ ہوتا تھا، لیکن بات دل میں اچھی طرح پیوست ہوجاتی تھی، تو بتانے کی بات یہ ہے کہ اہل اللہ کی صحبت کا ایک فائدہ یہ ہے کہ ان سے اصلاح کے نسخے معلوم ہوں گے اور ہم اپنی اصلاح کرنے میں اور گناہوں سے بچنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

❁ ایک سالک کا عبرت خیز واقعہ:

ایک بات اور یاد آگئی کہ ایک سالک نے مجھے سنایا کہ جب مجھ سے پہلے پہلے کہا جاتا تھا کہ اپنی نگاہوں کو پست رکھو اور نامحرموں کو نہ دیکھو تو میرے دل میں یہ آتا تھا کہ یہ مجھ سے کہا تو جا رہا ہے لیکن کیا یہ کہنے والے بھی اس پر عمل کرتے ہیں؟ یا بس ویسے ہی کہہ دیا کرتے ہیں؟ وہ کہنے لگے کہ میں سمجھتا تھا کہ یہ کہنے والے بھی شاید اس پر عمل نہ کرتے ہوں، کیونکہ مجھے یہ بات بہت ہی ناقابل عمل معلوم ہوتی تھی کہ ایک

حسین وجمیل عورت سامنے ہواوراس کو نہ دیکھوں، مگر میں نے یہ سوچ لیا کہ مجھ سے جو کہا جارہا ہے اس پر مجھے عمل کرتے رہنا چاہئے تاکہ دیکھوں کہ کیا نتیجہ نکلتا ہے، وہ سالک کہہ رہے تھے کہ میں برابر عمل کرتا رہا، اوراب میری حالت یہ ہے کہ الحمدللہ! میری آنکھیں نامحرم کے سامنے آتے ہی خود شرم سے جھک جاتی ہیں، اور اللہ کے خوف کی وجہ سے اس کو دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی، کہنے لگے کہ اب مجھے سمجھ میں آیا کہ مجھے نامحرموں سے نگاہ بچانے کا حکم دینے والے بھی ضرور اس پر عمل کرتے ہوں گے، اس لئے کہ اب مجھے خود بھی اس کی عادت وہمت ہو چکی ہے۔

میرے بھائیو! صحبت اہل اللہ کا یہ اثر دیکھئے اور عبرت حاصل کیجئے، اور اس سے یہ بھی سمجھ لیجئے کہ جب تک آدمی عمل نہیں کرتا اور شیخ کی بات پر مقلد محض بن کر نہیں چلتا اسے ساری بات سمجھ میں نہیں آتی، دیکھوان صاحب کو شیخ کی بات پہلے تو سمجھ میں ہی نہیں آئی کہ کیسے عورت سے نگاہ بچائیں، اور کیا یہ ممکن بھی ہے یا نہیں؟ لیکن جب شیخ کی بات پر بلا سمجھے ہی عمل شروع کردیا تو پھر بات سمجھ میں بھی آگئی اور پتہ چل گیا کہ وہ پہلے کس قدر جہالت میں تھے۔

۞ طہارت کی تیسری قسم:

اب آیئے آگے چلیں، طہارت کی تیسری قسم یہ ہے کہ باطنی اعضاء کو باطنی گناہوں سے پاک کیا جائے۔ باطنی اعضاء کیا ہیں؟ دل ودماغ، ان سے جو گناہ ہوتے ہیں، ان گناہوں سے اپنے آپ کو پاک وصاف کرلینا تیسرے نمبر کی طہارت ہے۔

۞ دل کی بیماریاں کیا ہیں؟

دل میں بھی بہت سے گناہ پیدا ہوتے ہیں، تکبر پیدا ہوتا ہے، عجب پیدا ہوتا

ہے، ریاکاری پیدا ہوتی ہے، حسد پیدا ہوتا ہے، بغض پیدا ہوتا ہے، جلن پیدا ہوتی ہے، حب دنیا، حب مال و دولت، یہ سارے گناہ دل سے ہوتے ہیں، دل کے گناہوں سے اگر آدمی اپنے آپ کو نہیں بچائے گا تو وہ بھی اللہ کی نظر میں گندہ ہے، اور اس کا دل بھی گندہ اور ناپاک ہے، لہٰذا اسے پاک کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

آج ہم لوگ پوری محنت ظاہر پر صرف کرتے ہیں، اسی کے اوپر پوری توجہ صرف کرتے ہیں کہ ہمارا ظاہر پاک ہو جائے۔ اگر ہمارے چہرہ پر داغ آجائیں، تو ہم پریشان ہو جاتے ہیں، اور ان کو نکالنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں، لیکن دل کے اوپر کتنی بھی گندگی آجائے، ناپاکی لگ جائے، داغ و دھبے لگ جائیں، تو اس کا ہمیں کوئی احساس نہیں ہوتا۔ حالانکہ دل کی صفائی کا خاص الخاص اہتمام کرنا چاہئے تھا۔

❁ زنگ آلود دل:

کیونکہ دل پر ہمارے گناہوں کا اثر ہوتا ہے اور وہ کالا اور زنگ آلود ہو جاتا ہے، حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب آدمی ایک گناہ کرتا ہے تو اس کے دل کے اوپر ایک دھبہ لگتا ہے، اگر وہ توبہ کرتا ہے سچے پکے دل کے ساتھ، تو وہ صاف ہو جاتا ہے، لیکن اگر اس نے توبہ نہیں کی اور گناہ پر گناہ کرتا رہا تو اس کے وہ داغ، دھبے بڑھتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ پورا دل کالا ہو جاتا ہے۔ یہ فرما کر آپ نے کہا کہ قرآن میں اللہ نے اسی کا ذکر اس آیت میں کیا ہے: ﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ (ہرگز نہیں، ان کے دلوں پر زنگ لگ گیا ہے)۔ (ترمذی: ابن ماجہ: ، مسند احمد:)

دیکھئے، اس حدیث میں اللہ کے نبی ﷺ نے صاف بتایا ہے کہ دل پر گناہ کا اثر ہوتا ہے کہ وہ زنگ کی وجہ سے کالا ہو جاتا ہے۔ اگر فوراً توبہ کر لیا تو وہ زنگ دور ہو جاتا

ہے ورنہ وہ بڑھتے بڑھتے سارے دل کو کالا و زنگ آلود کر دیتا ہے۔

دل کا زنگ کیسے پاک ہوگا؟

یہ دل کا زنگ اور کالک کیسے دور ہوگی؟ اس کا جواب ایک حدیث میں وارد ہوا ہے، وہ یہ کہ ایک موقعہ پر آپ انے فرمایا: "إِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوبَ تَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الْحَدِيدُ إِذَا أَصَابَهُ الْمَاءُ" (بلاشبہ ان دلوں پر زنگ آجاتا ہے جیسے لوہے پر زنگ آجاتا ہے جب اسے پانی لگ جاتا ہے) صحابہ نے پوچھا: " وَمَا جِلَاؤُهَا يَا رَسُولَ اللّٰهِ" (کہ اس زنگ کو صیقل کس طرح کیا جاسکتا ہے؟) تو آپ نے فرمایا: "كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةِ الْقُرْآنِ" (موت کی یاد اور تلاوت قرآن کی کثرت)۔(مشکوۃ:۱۸۹)

لہٰذا دل کے زنگ کو اس طرح دور کرنا چاہئے کہ موت کو یاد کیا کریں اور قرآن کی کثرت کے ساتھ تلاوت کیا کریں۔

حضرت مسیح الامت کی ایک تقریر کا خلاصہ:

مجھے میرے حضرت مسیح الامت نوراللہ مرقدہٗ کی ایک تقریر یاد آگئی، وہ یہ کہ آپ نے ایک دفعہ ایک حدیث پڑھی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اپنے گھروں کو صاف کرنے کے بعد یہودیوں کی طرح اپنے صحن کو ناپاک نہ رکھو، اس لیے کہ یہودی ایسے ہی کرتے ہیں"۔(مشکوۃ:۳۵۸)

یہ حدیث سنا کر حضرت نے فرمایا کہ جب رسول اللہ ﷺ گھر کے باہر کے حصے کو بھی ناپاک اور گندہ رکھنے کی اجازت نہیں دیتے اور اس کو بھی صاف کرنے کا حکم دیتے ہیں تو گھر کی صفائی کرنے کا تو بدرجۂ اولیٰ حکم ہوگا، اور جب گھر کی صفائی کا حکم

ہے تو ہمارے کپڑوں کو صاف کرنے کا تو اس سے زیادہ حکم ہوگا، اس لیے کہ گھر تو ہم کو لگا ہوا نہیں رہتا، کپڑے تو ہمارے جسم سے لگے ہوئے ہوتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ جب کپڑوں کی صفائی کا حکم ہے تو وہ جسم جس کے لیے کپڑے ہیں وہ کیوں پاک نہیں ہونے چاہئیں؟ وہ تو اس سے زیادہ پاک ہونے چاہئیں اور جب ظاہری جسم کو پاک کرنے کا حکم ہے تو اس جسم کا جو اصل ہے یعنی اندورن و باطن جس کو قلب کہتے ہیں، اس کی صفائی تو سب سے زیادہ ہونا چاہئے، اس لیے کہ قلب اصل ہے، ظاہری جسم اس کی سواری کی طرح ہے تو جب ظاہری جسم ہی کو دھونے کا حکم دیا گیا ہے تو اندر والے کو کیوں حکم نہیں ہوگا کہ وہ پاک وصاف رہے۔

جیسے کار کو دھونے کا حکم ہو تو اندر کار میں بیٹھنے والے صاحب کیا پاخانہ سے ملوث رہیں گے؟ بھائیو! جب ہم کار کے بارے میں چاہتے ہیں کہ اس کی ویل بھی پاک ہو اور اس کا اوپر والا حصہ بھی صاف ہو، پیچھے کیچڑ نہ لگا ہو، سامنے کچھ نہ لگا ہو، دھول نہ لگی ہو تو کیا ہم کار کے اندر ایسے شخص کو بٹھانا گوارا کریں گے جو ایک گندے نالے میں ڈوبا ہوا ہو؟ کیا کوئی اس کو سیدھے لا کر سیٹ پر بٹھا دے تو ہم گوارا کریں گے؟ نہیں، اسی طرح جسم تو ہو صاف مگر دل ہو گندہ تو اللہ کو یہ کیسے پسند آئے گا؟

جب اوپر کے حصہ کو اتنا صاف کر رہے ہیں تو اندر بیٹھنے والا تو سب سے زیادہ صاف ہونا چاہئے۔ جب ہمارے جسم کو ہم صاف کر رہے ہیں جو کہ کار کے مانند ہے تو اندر جو کار میں بیٹھنے والا ہے، یعنی دل وہ تو اس سے زیادہ پاک وصاف ہونا چاہئے۔

تکبر دل کی سب سے بڑی بیماری:

دل کی بہت سے گندگیاں اور بیماریاں ہیں، جن سے دل کو پاک کرنا ضروری

ہے، میں مثال کے طور پر بعض اہم بیماریوں کا تذکرہ کرتا ہوں، ان بیماریوں میں تکبر سرفہرست ہے، یعنی اپنے آپ کو کسی دینی یا دنیوی کمال میں بڑا سمجھنا اور دوسرں کو حقیر سمجھنا۔ اور تکبر عربی لفظ ہے، اور باب تفعل سے ہے، اور اس باب کی ایک خاصیت تکلف ہے، مطلب یہ ہے کہ آدمی حقیقت میں تو بڑا نہیں ہوتا، مگر اپنے آپ کو بڑا بنا کر پیش کرتا ہے، اور بڑا سمجھتا ہے ۔تکبر کی وجہ سے آدمی کا دل ناپاک ہوجاتا ہے، شیطان شیطان اسی لیے بنا کہ اس کے اندر تکبر تھا، ورنہ تو وہ بڑا عابد تھا، بڑا زاہد تھا، عالم تھا، لیکن تکبر نے اسکو خاک کردیا، یہاں تک کہ اس کو آسمانوں سے اُتار کر دنیا میں بھیج دیا بلکہ پھینک دیا گیا۔

اب یہاں یہ بھی سمجھتے چلئے کہ تکبر سب سے بڑی بیماری کیوں؟ علماء نے لکھا ہے کہ تکبر کی حقیقت دو چیزیں ہیں : ایک ہے اپنے آپ کو بڑا سمجھنا، اور دوسرا دوسروں کو حقیر سمجھنا۔ ان دو چیزیں سے تکبر پیدا ہوتا ہے، اور اگر ان دو میں سے صرف ایک چیز آپ کو بڑا سمجھنے کی بات پائی جائے تو اس کا نام عُجب ہے، وہ بھی ایک برا خلق اور بڑی بیماری ہے، اور دل کی بیماریوں میں سے ایک خطرناک بیماری ہے، اگر صرف دوسرے کو حقیر سمجھتا ہے، اپنے کو بڑا نہیں سمجھتا تو یہ دوسرے آدمی کی توہین وتذلیل ہے، یہ بھی اسلام میں ناجائز ہے۔

اور اگر دونوں باتیں ہوں کہ خود کو سب سے اچھا اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے تو اس کا نام تکبر ہے، معلوم ہوا تکبر کے دو جز ہیں، دونوں جمع ہوں تو بھی خراب، اور اگر الگ الگ پائے جائیں تو بھی خراب، ظاہر ہے کہ جب ان دو میں سے ہر بیماری خطرہ ہے تو دونوں کسی میں جمع ہوجائیں تو کیا اس کا خطرہ اور بڑھ نہیں جائے گا؟ اسی لئے اس کو سب سے زیادہ خطرناک بیماری کہا گیا ہے، اور ام الامراض نام دیا گیا ہے۔

بڑائی اللہ ہی کو سزاوار ہے:

اس کے ساتھ ایک اور وجہ بھی ہے، وہ یہ کہ بڑائی تو صرف اللہ تعالی ہی کو سزاوار ہے ،وہی اس کا مستحق ہے کہ وہ بڑائی جتائے اور تکبر کرے، کسی بندے کو کیا حق ہے کہ وہ تکبر کرے؟ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ "الكبرياء ردائي والعظمة إزاري، فمن نازعني واحدا منهما قذفته في النار" (کبریائی میری چادر ہے، اور عظمت میری ازار ہے، پس جو شخص ان میں سے کسی میں بھی میرے سے جھگڑے گا تو میں اس کو دوزخ کا عذاب چکھاؤں گا''۔(ابو داود: ۴۰۹۰، واللفظ لہ، ابن ماجہ: ۴۱۷۴، مسند احمد: ۴۱۴/۲، صحیح ابن حبان: ۳۵/۲)

مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی کی شان ہے کہ وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھے، اس لئے کہ ساری کائنات کا ہر ذرہ اس کا محتاج ہے اور وہ کسی کا محتاج نہیں اور ساری کائنات بے قدر و بے حقیقت ہے اور اللہ ہر چیز کا مالک اور ہر چیز پر قادر ہے، اسلئے تکبر اس کی صفت ہے اور جو اس کی صفت میں شریک ہونا چاہے، گویا وہ اللہ کی صفت میں اپنے کو شریک کر کے شرک کرنا چاہتا ہے، اس لئے اللہ اس کو عذاب دیتے ہیں، اس لئے کہ اس کے برابر کوئی نہیں نہ ذات میں نہ ہی صفات میں۔

تکبر کا ایک علاج:

تکبر میں آج ہر آدمی مبتلا ہے، جوان ہو یا بوڑھا، عرت ہو یا مرد، امیر ہو یا غریب۔ ایک نو جوان متکبر کا قصہ یاد آیا کہ ایک بزرگ نے اس کو غلط کام کرنے کی وجہ سے ٹوکا تو وہ غصہ میں آ گیا اور کہنے لگا کہ اچھا مجھے آپ نصیحت کرتے ہیں؟ معلوم

ہے میں کون ہوں؟

یہ جملہ آج لوگوں کے درمیان ایک فیشن بنا ہوا ہے، ہر شخص کہتا ہے کہ جانتے ہو، میں کون ہوں؟ جب آدمی میں تکبر ہوتا ہے تو یہ جملے کہتا ہے، یعنی اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے۔

اس پران بزرگ نے کہا کہ ہاں ہاں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تو ایک زمانہ نطفۂ ناپاک تھا، گندہ پانی، منی کا ناپاک قطرہ تھا، اور ایک زمانہ پھر ایسا آئے گا کہ تو مر جائے گا تو جیفۂ ناپاک ہو جائے گا مردار بنا پڑا ہوگا، اور فی الحال تیری حالت یہ ہے کہ پانچ سات کلو پاخانہ اپنے پیٹ میں لیے پھر رہا ہے۔ یہ ہے تیری حالت جو میں جانتا ہوں۔

حضرت نے اس سے پوری حقیقت واضح کر دی، اور اس کا سارا تکبر توڑ دیا اور دماغ کا سارا خناس نکال دیا۔

اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ قرآن میں فرمایا ہے: ﴿ أَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ﴾ [یٰس:] (کیا آدمی یہ نہیں دیکھتا، غور و فکر نہیں کرتا کہ ہم نے اس کو ناپاک قطرہ سے بنایا اور بڑا ہو کر یہ ہم سے ہی جھگڑتا ہے)

یہ کمال تو اللہ کا ہے، تیرا کیا کمال ہے؟ تیری حقیقت تو نطفہ ناپاک ہے، پتہ نہیں کہاں پڑا ہوا تھا گندگی میں، اللہ نے نکال کر تیرے اندر یہ صلاحیت و خوبی بخشی، ماں کے رحم میں داخل کیا، ماں کے رحم میں بنایا، پھر ماں کے رحم سے باہر نکالا، اور دن بدن پروان چڑھایا اور تربیت کی، یہاں تک کہ تیرے اندر بہت ساری چیزیں ودیعت فرما کر ایک بہترین انسان بنا دیا، اور یہ انسان جب بڑا ہو جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ ہی سے جھگڑتا ہے اور کہتا ہے کہ کہاں ہے اللہ بتاؤ؟ واہ میاں واہ! پیدا کیا، بنایا،

کھلایا، پلایا، صلاحیت وخوبیاں بخشیں، اتنا سب کچھ دیکھ کر کہتا ہے کہاں ہے اللہ؟

تو یہ تکبر جب آجاتا ہے آدمی کے اندر تو اس طرح کی بیماریاں اس کے اندر پنپنے لگتی ہیں، پھلنے پھولنے لگتی ہیں، اور آگے چل کر وہی خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہیں جس کی وجہ سے وہ دوزخ میں بھیجا جاتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ:

”لا يدخل الجنة أحد فی قلبه مثقال حبّة من خردل“

(جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہو وہ جنت میں نہیں جائے گا۔(ابن ماجہ:۴۱۶۳، مسلم:۱۳۱، ترمذی:۱۹۹۹، ابوداود:۴۰۹۱)

جنت میں داخل نہیں ہوگا تو پھر کیا ہوگا؟ ظاہر بات ہے جہنم میں داخل ہوگا، وہاں اس کی صفائی ہوگی۔

جہنم باطنی بیماریوں کا ہسپتال ہے:

یہ بھی اللہ نے مسلمانوں کے لیے کرم فرمایا ہے کہ ان کی صفائی کا وہاں ایک مرکز جہنم کی شکل میں قائم کر دیا ہے، گویا کہ بیماریوں کو صاف کرنے کے لیے ایک ہسپتال بنا دیا ہے، جہنم بیک وقت دو کام کرتی ہے، کافروں کے لیے قید خانہ ہے اور مؤمنوں کے لیے ہسپتال، جیسے ہسپتال میں آدمی کو داخل کریں تو کیا ہوتا ہے؟ صفائی ہوتی ہے اور اس کی بیماریوں کو دھو کر صاف کر کے اسے ٹھیک ٹھاک بنا کر پھر بڑے اعزاز کے ساتھ ڈاکٹر صاحبان اسے ایمبولنس میں بٹھا کر گھر بھیجتے ہیں۔

اسی طریقہ پر اللہ تعالیٰ مومن بندے کو جہنم میں داخل کر کے اسے اچھی طرح پاک وصاف کرتے ہیں، جب پاک وصاف ہو جاتا ہے تو پھر اسے جنت میں بھیج دیا جاتا ہے، لیکن جب تک ٹھیک نہیں ہوتا اس وقت تک تو جہنم میں رہنا پڑے گا۔

یہاں ایک اور بات ذہن میں آتی ہے، وہ یہ کہ اللہ نے دو ہسپتال بنائے ہیں، ایک اختیاری ہسپتال، ایک اضطراری ہسپتال، دنیا اختیاری ہسپتال ہے، آپ یا تو دنیا ہی کو اپنا ہسپتال بنالیں اختیاری ہسپتال، چاہے تو خود ہی دنیا میں کسی کو اپنا شیخ و رہبر بنا کر اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے دل کی، دماغ کی، اپنے ظاہر کی، باطن کی اصلاح کر کے صاف پاک ہوجایئے، جب اس طرح یہیں پاک وصاف ہوجائیں گے، تو اللہ کے فرشتے موت کے وقت آکر کہیں گے ﴿ یٰاَیَّتُھَا النَّفُسُ الُمُطُمَئِنَّةُ ارُجِعِیُ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرُضِیَّةً فَادُخُلِیُ فِیُ عِبَادِیُ وَادُخُلِیُ جَنَّتِیُ ﴾ (اے نفس مطمئنہ! لوٹ جا اپنے پروردگار کی طرف، اس حال میں کہ اللہ تیرے سے راضی اور تو اللہ سے راضی ہو، میرے نیک بندوں میں داخل ہوجا اور میری جنت میں داخل ہوجا)

کیونکہ اب یہ نفس اصلاح پاکر، پاک وصاف ہوکر نفسِ مطمئن ہوگیا، پوری طرح صاف وپاک، بالکل ٹھیک ٹھاک ہوگیا ہے لہٰذا یہ نفس مطمئنہ ہے، لیکن جس نے یہ کام دنیا میں نہیں کیا، تو اضطراری ہسپتال میں وہاں داخل کیا جائے گا، ہم مانیں تو بھی جانا پڑے گا، نہ مانیں تو بھی جانا پڑے گا۔ یہاں جس نے اپنی غفلت اور لاپرواہی سے اپنا علاج نہیں کرایا ہوگا، اللہ کا آرڈر ہوتا ہے کہ ہمارے گورنمنٹ ہسپتال بھی تو موجود ہے، یہ پرائیویٹ ہسپتال میں علاج کو نہیں گیا تھا تو گورنمنٹ ہسپتال میں داخل کریں گے اور وہاں کے فرشتے اس کا علاج کریں گے، گندگیوں اور نجاستوں کو صاف وپاک کر کے، ٹھیک ٹھاک کردیں گے، پھر اسے کہا جائے گا کہ چلو اب اپنے اصلی مقام پر چلو، اور جنت میں رہو۔

ایک علمی نکتہ:

ابھی میں نے عرض کیا کہ موت کے وقت نفس مطمئنہ سے اللہ کے فرشتے کہیں گے:﴿ اِرۡجِعِیۡ اِلٰی رَبِّکِ ﴾ کہ تو لوٹ جا اپنے رب کی طرف، اس میں بھی ایک نکتہ ہے، وہ یہ کہ نفس مطمئنہ سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ " اذهبي إلى ربك " کہ تم اپنے رب کی طرف جاؤ، بلکہ یہ کہا کہ ''لوٹ جاؤ اپنے رب کی طرف''، اس لئے کہ ہم وہیں سے یہاں دنیا میں آئے ہوئے ہیں، ہم یہاں کے رہنے والے نہیں، بلکہ جنت ہی کے رہنے والے ہیں، اس لئے کہا جائے گا کہ واپس اپنی مقام وطن کو چلو۔

یہ دیکھئے یہ حافظ احمد وحید صاحب بنگلور کے مدرسہ سے آئے ہیں، اب ان کو ہم جاؤ نہیں کہیں گے، بلکہ یہ کہیں گے کہ ''لوٹ جاؤ'' اس لیے کہ وہیں سے آئے ہیں، اب وہیں چلے جاؤ، واپس ہو جاؤ۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہیں سے ہم سب آئے تھے، اور وہاں سے یہاں کچھ ترقی کے لئے آئے تھے، کچھ ڈگریاں پاس کر کے جانے کے لئے آئے تھے، جب یہاں ٹھیک ٹھاک ہو گئے اور ان کو حاصل کر لیا تو اب کہا جا رہا ہے کہ ''اپنے رب کی طرف لوٹ جایئے، اس حالت میں کہ اللہ تم سے راضی ہے اور تم اللہ سے راضی ہو، پہلے آیا تھا تو یہ صفت حاصل نہیں تھی، اب اس صفت کے ساتھ متصف ہو کر لوٹ جا۔

یہ کب ہوگا؟ جب دنیا کی اختیاری ہسپتال میں رہ کر اس نے کسی رہبر کو رہبر بنا کر اپنے آپ کو پاک وصاف کر کے نفس امارہ کو نفس مطمئنہ بنا لیا ہوگا، تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اللہ کا فرشتہ یہ اعلان کرے گا، اور تسلی دے کر یہاں سے روح قبض کر کے لے جائے گا۔

ایمان جنت کا ویزہ ہے:

ایمان جنت کا ویزہ ہے، جنت کا ویزہ آپ نے لے رکھا ہے، لیکن جنت کا ویزہ لے کر آپ جنت میں جانے کے لیے پہنچیں گے تو وہاں پہلے ٹیسٹنگ ہوگی، جیسے ویزہ آنے کے بعد انڈیا سے سعودی عرب جانا چاہیں، تو آپ کو کہا جائے گا کہ ڈاکٹر سے میڈیکل سرٹیفکیٹ لاؤ، پھر ڈاکٹر لکھ کر دے گا کہ ہاں ان کو کوئی خطرناک بیماری نہیں ہے، تب وہ ویزہ اُو کے (ok) کر کے آپ کو اندر جانے کی اجازت دے گا، لیکن اگر بیماری ہے تو کہہ دیا جائے گا کہ نہیں جناب! ہمارے پاس بالکل ٹھیک ہو کر آیئے، ورنہ نہیں آسکتے، آپ کو یہ بیماری ہے، جب تک وہ بیماری آپ کی صاف نہیں ہوگی، آپ ٹھیک نہیں ہوں گے، ہمارے ملک میں داخلہ نہیں ہوسکتا۔

اسی طریقہ پر جب یہاں سے آدمی چلا جائے گا، ایمان کا ویزہ لے کر جنت میں جانا چاہے گا تو اسے روک دیا جائے گا کہ جناب! آپ ابھی اس قابل نہیں ہیں، پہلے ذرا ہسپتال یعنی جہنم کی ہوا کھایئے، آپ وہاں پاک وصاف ہوجایئے، جب پاک وصاف ہوجائیں گے تب اس میں داخلہ ملے گا۔

الغرض آپ کے پاس ایمان جو کہ جنت کا ویزہ ہے وہ تو ہے ہی، اسے او کے (ok) بعد میں کیا جائے گا، اسے پہلے جہنم کی ہوا کھلائی جائے گی اور وہاں فرشتے اسے پاک وصاف کریں گے، اگر یہیں دنیا میں یہ پاکی و طہارت کا کام کر لیتا تو بہت اچھا ہوتا، لیکن جب یہاں دنیا میں صفائی نہیں کرایا تو وہاں فرشتے ڈنڈے مار مار کر اس کی صفائی کریں گے، جہنم کی سختیوں کے ساتھ، مصائب و پریشانیوں کے ساتھ، سارے عذابات کے ساتھ وہاں صاف کیا جائے گا، اس لیے کہ اس نے اختیاری مجاہدہ نہیں کیا تھا، اس لئے اب اضطراری مجاہدہ کرنا پڑے گا۔

جب وہاں وہ پاک وصاف ہوجائے گا تو جنت میں داخلہ ملے گا۔

جہنم بھی اہل ایمان کے حق میں نعمت ہے:

تو اب بتاؤ بھائی! جہنم اہل ایمان کے حق میں کتنی بڑی نعمت ہوئی؟ ظاہری بیماریوں کو پاک وصاف کرنے والی ہسپتال کو تو ہم نعمت سمجھتے ہیں، لیکن باطنی بیماریوں کو صاف کرنے والی جہنم کو نعمت نہیں سمجھتے، جو ہماری بیماریوں کا علاج کرکے ہمیں جنت میں جانے کے لائق بناتی ہے، یہ بھی اللہ کی نعمت ہی تو ہے، اس لیے میں نے کہا کہ جہنم بھی مؤمن کے لیے نعمت ہے۔

ایک حدیث بھی آپ کو سنا دیتا ہوں، جو بڑی عجیب ہے، وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”کافر لوگ جو کہ اہل دوزخ ہیں وہ جہنم میں نہ تو مریں گے اور نہ زندہ ہی رہیں گے اور رہے وہ لوگ جو اپنے گناہوں کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے یعنی گنہ گار مومن تو ان کو اللہ تعالی ایک قسم کی موت دیدیگا حتی کہ جب وہ جل کر کوئلہ ہوجائیں گے تو ان کے حق میں شفاعت کی اجازت دیگا، تو ان کو جماعت در جماعت جنت کی نہروں پر لایا جائے گا اور جنتیوں سے کہا جائے گا کہ ان پر پانی بہاؤ۔

یہ صحیح حدیث ہے، جس کو امام مسلم وغیرہ محدثین نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔(مسلم: ۱۸۵، ابن ماجہ: ۴۳۰۹، مسند احمد: ۱۱/۳، مسند ابو یعلی: ۵۱۸/۲، شعب الایمان: ۲۹۲/۱)

دیکھئے! جہنم کتنی بڑی نعمت ہے کہ ایک بیمار کا علاج کرکے اسے جنت میں جانے کے لائق بناتی ہے اور تکلیف کا احساس نہ ہو اس کے لئے یہ خدائی انتظام کہ ان گنہ گار مسلمانوں پر ایک قسم کی موت طاری کردی جاتی ہے، جیسے آپریشن کے وقت ڈاکٹر حضرات مریض کو کلوروفارم دیکر بے ہوش کردیتے ہیں، یہ بھی ایک رحمت

وشفقت کی بات ہے اسی طرح اللہ کے یہاں بھی ایسا ہی انتظام ہوگا۔

اللہ اکبر! تو معلوم ہوا کہ جہنم بھی نعمت ہے، جب جہنم ایک نعمت ہے، تو اس سے ایک آیت کی تفسیر بھی سمجھ لیں۔

ایک آیت کی تفسیر:

قرآن پاک میں سورۂ رحمٰن میں جگہ جگہ ایک آیت دہرائی گئی ہے: ﴿ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴾ (اے جنات اور انسانوں کے گروہ! تم اللہ کی کون کونسی نعمتوں کو ٹھکراؤ گے)

یہ آیت مختلف قسم کے مضامین کے بعد لائی گئی ہے اور سورۂ رحمٰن میں بعض جگہ ایسی آیتیں بھی ہیں، جن میں جہنم کے دردناک عذاب کا تذکرہ ہے، اور اس کے بعد بھی یہ آیت لائی گئی ہے، مثلاً ارشاد باری ہے:

﴿ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّن نَّارٍ وَنُحَاسٌ فَلَا تَنتَصِرَانِ ﴾ (آگ کے شعلے اور دھواں تم پر چھوڑا جائے گا، پس تم مدد نہ کئے جاؤ گے) اس آیت کے متصلاً بعد وہی آیت دہرائی گئی ہے: ﴿ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴾ (اے جنات اور انسانوں کے گروہ! تم اللہ کی کون کونسی نعمتوں کو ٹھکراؤ گے)

اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ آیت میں عذاب کی دھمکی دی جارہی ہے، وعید سنائی جارہی ہے، پھر اس کے بعد نعمتوں کی یاددہانی اور ذکر کا کیا موقعہ ہے؟

ابھی جو مسلم شریف کی حدیث سنائی گئی ہے، اس سے آپ کو جواب آسانی سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ مؤمن کو جہنم میں کوئی خاص تکلیف نہ ہوگی، اور اس پر ایک قسم کی موت طاری ہوگی، جب اس کو کوئی تکلیف نہیں، بلکہ یہ جہنم مؤمن کے لئے ایک ہسپتال کی طرح ہے جہاں بیماریاں صاف ہوتی ہیں، اور یہ اس کے حق میں یقیناً

راحت ونعمت ہے،اس لئے اس موقعہ پر نعمتوں کی یاددہانی بے موقعہ نہیں۔

الغرض جنت تو نعمت ہے ہی اللہ کی ،جہنم بھی مؤمن کے حق میں نعمت ہوگی اور ان آیتوں کی اس سے تفسیر بھی ہوگئی ، یہ نکتہ آج ہی سمجھ میں آیا،اس سے پہلے سمجھ میں نہیں آیا تھا،اللہ نے آپ حضرات کی برکت سے یہ بات فہم میں ڈال دی،اور علم عظیم عطاءفرمادیا۔

ریاکاری دل کی دوسری بیماری:

اسی طریقہ پردل کی بیماریوں میں سے ایک بیماری ریاکاری ہے،یعنی اللہ کی اطاعت دوسروں کودکھانے اور خوش کرنے کے لیے کرنا،مثلاً آدمی نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے،تلاوت کرتا ہے،لیکن ان ساری عبادتوں کے اندر یہ جزبہ پیدا ہوجائے کہ لوگ مجھے دیکھا کریں اور مجھے واہ واہ کہیں،لوگ میرے سے خوش ہوجائیں،میری تعریف کریں، یہ نیت دل میں رکھ کرعبادت کرنے کا نام ریاکاری ہے۔

اللہ کی نظر میں اس عبادت کا کوئی اعتبار نہیں جو غیر اللہ کے لیے کی جائے ، بلکہ حدیث میں اسے شرک خفی کہا گیا ہے،ایک تو شرک جلی ہے، بتوں کی پوجا کرنا،اللہ کے ساتھ غیر اللہ کو شریک کرنا ، ذات میں یا صفات میں یا اس کے افعال میں، یہ کھلا ہوا شرک ہے،اور ریاکاری شرک خفی ہے، کتنی خطرناک بیماری ہے کہ اللہ کے نبی نے اسے شرک خفی قراردیا ہے؛ کیونکہ یہ دیکھنے میں تو خدا کی عبادت ہے،لیکن دل میں غیر اللہ کی خوشنودی مقصود ہے،اس لیے یہ شرک خفی ہے۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

’’قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ اگلے پچھلے تمام بندوں کو جمع کرے گا تو ایک منادی ندا دیگا کہ جس نے اللہ کی عبادت میں دوسرے کو شرک کیا تھا وہ انہیں کے

پاس جائے جن کو دکھانے کے لیے نیک کام اور عبادت کرتا تھا۔
(ترمذی:۳۱۵۴،ابن ماجہ:۴۲۰۳ ، مسند احمد:۴۶۶/۳،صحیح ابن حبان: ۱۳۰/۲،معجم کبیر:۳۰۷/۲۲)

مطلب یہ ہے کہ ریاکاروں سے یہ کہا جائے گا کہ تمہاری عبادت و نیکی کا ثواب بھی ان لوگوں سے لے لو اور طاعت کا صلہ بھی انہیں سے لے لو اور دیکھو کیا دیتے ہیں؟

نیز ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ''قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ بندوں کا حساب وکتاب لیں گے تو عابد، عالم اور سخی کو اللہ کے دربار میں پیش کیا جائیگا، اور تینوں اپنے اپنے اعمال کا اظہار کریں گے، ارشاد ہوگا کہ یہ سب اعمال تم نے اس لئے کئے ہیں تاکہ لوگ تمہیں کہیں کہ فلاں شخص مجاہد ہے، فلاں شخص بڑا عالم ہے، فلاں آدمی بڑا سخی ہے اور یہ باتیں تم کو دنیا میں حاصل ہوگئیں، جس مقصد کے لیے نیک اعمال کیے تھے، وہ حاصل ہو چکا۔لہٰذا اب یہاں کیا چاہتے ہو، جاؤ جہنم میں، اور ان کو فرشتے اوندھے منہ جہنم میں ڈال دیں گے۔(مسلم: ۱۹۰۵، نسائی: ۳۱۳۷، مستدرک: ۱۸۹/۱)

معلوم ہوا کہ ریاکاری سے کیا ہوا کام اللہ کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا، اس لیے کوئی بھی کام کرنے سے پہلے نیت کو خالص اللہ کے لیے کرنا چاہئے۔

اخلاص کا فقدان دین میں بہت بڑا شگاف ہے:

مرتب عرض کرتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت والا کا ایک مدرسہ جانا ہوا، احقر (مرتب) بھی ساتھ تھا، وہاں کے ذمہ داروں نے حضرت والا سے درخواست کی کہ

مدرسۂ ھذا کے مدرسین کے مابین کچھ اختلافات ہیں، اس لئے اساتذہ کو کچھ نصیحت فرمادیں، تو حضرت والا نے کچھ قیمتی باتیں ان سے فرمائیں، جس میں اخلاص کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ دین کی خدمت کرنے والوں میں اخلاص کا ہونا بہت ضروری ہے، اخلاص کا فقدان دین کے کاموں میں، مدارس میں، مساجد میں، دینی اداروں میں بہت بڑا شگاف ہے، جس سے شیطان کا حملہ بہت آسانی کے ساتھ ہو جاتا ہے اور وہ ہمارے ایمان واعمال پر حملے میں کامیاب ہو جاتا ہے، جیسے حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ کے واقعات میں لکھا ہے کہ ٹیپو سلطان شہیدؒ نے جو سری رنگا پٹنم میں انتہائی مضبوط قلعہ بنایا تھا تا کہ دشمن حملہ نہ کر سکے، اسی قلعے میں دشمن اسلام انگریز ایک شگاف بنا کر قلعہ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے، ہوا یہ کہ ان کے ایک وزیر میر صادق نے حضرت ٹیپو سلطان سے غداری کی، اور انگریزوں سے اس نے ساز باز کرلی، اسی کے اشارے سے انگریزی فوج نے اس قلعے میں ایک جگہ شگاف ڈال دیا اور اس سے اندر جانے میں کامیاب ہو گئے، یہاں تک کہ اسی کے بعد جنگ میں ٹیپو سلطان شہیدؒ کی شہادت کا روح فرسا اور انتہائی دردناک والم انگیز واقعہ پیش آیا۔

حضرت والا نے فرمایا کہ میں کہتا ہوں کہ ٹیپو سلطان شہیدؒ کے قلعہ میں شگاف پڑ جانے سے بھی کہیں زیادہ بھاری نقصان دینی خدام میں اخلاص کے نہ ہونے کی وجہ سے جو شگاف پڑتا ہے اس سے ہوتا ہے، جس کی تلافی بھی نہ ہو سکے گی، وہاں تو صرف ٹیپو سلطان شہید ہو گئے اور ان کی قلعے کی عمارت منہدم ہوگئی اور حضرت ٹیپو کی حکومت ختم ہوگئی تھی، لیکن یہاں دین وایمان کی عمارت منہدم ہو جائے گی اور ظاہر ہے کہ دین کا نقصان سب سے بھاری نقصان ہوتا ہے، اور اخلاص کے فقدان کا

شگاف ایسا خطرناک ہوتا ہے،جس سے بہت سارے فتنوں کو درآنے کا موقعہ ملتا ہے، بہت سارے مدارس ذمہ داروں اور مدرسین میں اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے تباہی وبربادی کا شکار ہو چکے ہیں ، بڑے بڑے مدارس میں تالا لگ چکا ہے ،وجہ صرف یہ ہے کہ مقصود اللہ کی رضا نہ ہونے کی وجہ سے آپس میں اختلافات پیدا ہو گئے ،نوبت یہاں تک پہنچی کہ مدارس بند ہو گئے یا دوٹکڑے ہو گئے ،اس کے برخلاف جن میں اخلاص ہوتا ہے ان کا انداز ہی نرالا ہوتا ہے، مخلصین وغیر مخلصین میں بین فرق ہوتا ہے،اور اللہ کی رضا کے لئے کام کرنے والا ہر کام میں یہ سوچتا ہے کہ میرے کام سے اللہ خوش ہو جائے اور جو یہ سوچ کر کام کرے وہ کہاں دنیا کے جھگڑوں میں پڑے گا، وہ کہاں اختلاف کرتا پھرے گا۔

پھر فرمایا کہ پانچ باتیں ہیں ،جن پر عمل کرنے سے مدارس ترقی کریں گے، (۱) سب سے پہلے تو اخلاص ہو جیسا کہ عرض کر چکا ہوں (۲) دوسرے یہ کہ مدرسہ میں جو بھی اصول ونظام بنایا جائے اس پر عمل کریں ،مثلاً اوقات جو طے کر دئے جائیں اس کی مکمل پابندی کی جائے ،اسی طرح جو ذمہ داریاں متعین کی جائیں ان کو پورا پورا نبھانے کی کوشش کرے۔جب تک اصول کی پابندی نہیں ہوگی کوئی کام صحیح نہیں ہوگا۔(۳) تیسرے یہ کہ مدرسہ میں رہنے والوں میں بھائی چارگی ہو، ہر ایک دوسرے کو اپنا بھائی خیال کرے ،سب ایک دوسرے کو اپنا معاون سمجھیں ،اور اسی طرح آپسی معاملہ کریں (۴) چوتھے یہ کہ بچوں کے ساتھ محبت وشفقت کا برتاو کیا جائے ، کیونکہ ہم خدام مدارس ہی ان کے دراصل باپ وماں اور بھائی بہن سب کچھ ہیں ،ان کی ضروریات کا لحاظ رکھا جائے ،ان کی طبیعت کی فکر کی جائے وغیرہ۔(۵) پانچویں بات یہ ہے کہ اپنی منزل اور مقصود پر ہمیشہ نظر رہے کہ مجھے

کہاں تک پہنچنا ہے، جیسے ایک بلڈنگ بنانے والا پہلے متعین کر لیتا ہے کہ مجھے کیسی اور کتنی منزل والی عمارت بنانا ہے، یا کوئی اور کام کرنے والا اپنا ٹارگیٹ مقرر کرتا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ اور مقصود اس کام سے کیا ہے، پھر سب کام و خدمات اسی کے مطابق انجام دیتا رہے۔

دنیا کی محبت دل کی تیسری مہلک بیماری:

تیسری چیز جو دل کی بیماریوں میں سے ایک بڑی بیماری ہے، وہ ہے دنیا کی محبت، دل دنیا کی محبت میں گرفتار ہو جائے، مال کی محبت، مکان کی محبت، دکان کی محبت، ہر وقت انہی کی فکر میں لگا ہوا ہو، اور اللہ کو یاد ہی نہ کرتا ہو، اللہ کی محبت دل میں بسانے کے بجائے دنیا کی محبت سمائی ہوئی ہو، یہ بھی بڑی خطرناک قسم کی بیماری ہے، بلکہ حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”حُبُّ الدُّنیَا رَأْسُ کُلِّ خَطِیْئَةٍ “ (دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے) (شعب الایمان: ۷/۳۳۸)

اس لیے کہ جب دنیا کی محبت آتی ہے تو آدمی تمام برائیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، حلال بھی نہیں دیکھتا، حرام بھی نہیں دیکھتا، اچھا بھی نہیں دیکھتا، برا بھی نہیں دیکھتا، کسی کا کوئی پاس و لحاظ بھی نہیں، بلکہ ظلم و زیادتی سے بھی کمائی کر لیتا ہے، اور وہ کسی چیز کی تمیز نہیں کرتا، اس لیے کہ دنیا کی محبت نے اسے مجبور کر دیا ہے کہ اس کے لئے ہر قسم کا کام کر کے اس کو حاصل کرے۔

ایک دل میں خدا اور دنیا کی محبت جمع نہیں ہو سکتی:

میرے بھائیو! یاد رکھو کہ دنیا کی محبت جس کے دل میں ہو، اللہ کی محبت کبھی اس کے دل میں نہیں آسکتی۔ حدیث میں آتا ہے اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ: ” مَنْ

أَحَبَّ دُنْيَاهُ أَضَرَّ بِآخِرَتِهِ وَ مَنْ أَحَبَّ آخِرَتَهُ أَضَرَّ بِدُنْيَاهُ ، فَآثِرُوا مَا يَبْقٰى عَلٰى مَا يَفْنٰى"(جس نے اپنی دنیا سے جی لگا لیا اس نے اپنی آخرت کا نقصان کیا اور جس نے اپنی آخرت سے جی لگا لیا اس نے اپنی دنیا کا نقصان کیا، لہٰذا تم باقی رہنے والی چیز کو فنا ہونے والی چیز پر ترجیح دو)(مسند احمد: ۴۱۲/۴، مستدرک: ۳۴۳/۴، شعب الایمان: ۲۸۸/۷)

علماء کہتے ہیں کہ دنیا اور آخرت یہ دونوں ایسے ہیں جیسے دو سوکنیں ہوتی ہیں، اور دو سوکنیں ایک جگہ کبھی خوشی کے ساتھ جمع ہو سکتی ہیں؟ کبھی نہیں ہو سکتیں، دونوں کے اندر ہمیشہ جھگڑا رہے گا، اس کو خوش کرو تو یہ ناراض اور دوسری کو خوش کرو تو پہلی ناراض، اللہ کے نبی ﷺ کہتے ہیں کہ اسی طریقہ پر دنیا کو پانا چاہو گے تو آخرت تم سے چھوٹ جائے گی اور آخرت کو حاصل کرو گے تو ضرور دنیا تم سے دور ہو جائے گی، لہٰذا اگر خدا کو ناراض کرو گے تو دنیا مل سکتی ہے، دنیا کو ناراض کرو تو پھر اللہ مل سکتا ہے، لیکن یہ کہ بیک وقت دونوں کو راضی کر کے رکھیں، اللہ کے نبی کہتے ہیں کہ یہ ممکن نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی محبت کو دل سے نکالنے کی ضرورت ہے، تاکہ اللہ کی محبت ہمارے اندر آئے۔

دنیا کی محبت کا نشہ شراب کے نشہ سے بڑھا ہوا ہے:

فرمایا کہ آدمی جب شراب پی لیتا ہے تو اسے نشہ آتا ہے اور جب نشہ آتا ہے تو اس کے نتیجہ میں وہ بہت سارے برے کام کر بیٹھتا ہے، یعنی شراب پینا ایک ایسا خبیث کام ہے جس کی وجہ سے بہت سارے خبائث وجود میں آتے ہیں، جیسے ایک واقعہ ہے کہ ایک آدمی کو مجبور کیا گیا کہ تین چیزوں میں سے ایک کو اختیار کرے، یا زنا کر لے، یا ایک آدمی کو قتل کر دے، یا شراب پی لے، تو اس نے سوچا کہ زنا اور قتل تو

بڑے گناہ ہیں، اس لئے چلو شراب پی لیتے ہیں، تو اس نے شراب پی لی، جب شراب پیا تو نشہ میں زنا بھی کرلیا اور قتل بھی کر بیٹھا، تو اس طرح شراب دیگر گناہوں کے لئے دروازہ بنتا ہے۔

لیکن میں کہتا ہوں کہ شراب کے نشہ سے بھی زیادہ دنیا کی محبت کا نشہ ہے کہ جس پر اس کا نشہ سوار ہو جا تا ہے، وہ نہ حلال کی تمیز کرتا ہے، نہ حرام کی تمیز کرتا ہے، اور نہ اپنے کو دیکھتا ہے نہ پرائے کو دیکھتا ہے۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اوپر سے نیچے تک ہمارے بادشاہوں میں چند کو مستثنیٰ کر کے اکثر میں عیاشی تھی، قتل وقتال ان کا مشغلہ بن گیا تھا، ظلم و زیادتی ان کی عادت بن گئی تھی، روزانہ بے گناہوں کا قتل ہو رہا ہے، ناانصافیوں کا ایک طویل وعریض سلسلہ ہے، حق و باطل میں کوئی تمیز قائم نہیں ہے، بلکہ باپ بیٹے کو یا بیٹا باپ کو قتل کرا رہا ہے۔

حجاج بن یوسف کے بارے میں لکھا ہے کہ جب تک روزانہ کم از کم ایک قتل کا حکم صادر نہیں کر دیتا تھا، اسے چین نہیں آتا تھا، بے شمار علماء وصلحاء بلکہ بعض صحابہ کو بھی اس نے قتل کیا ہے، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو بھی اسی نے قتل کیا تھا اور ان کا سر نکال کر کعبہ پر لٹکا دیا تھا، تاریخ ایسے بادشاہوں کے واقعات سے بھری پڑی ہے، اسی طرح اسلامی تاریخ میں غداروں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی، جن کے مکر وسازش کی وجہ سے اسلام کو اور ملک کو بڑا نقصان ہوا ہے۔

اس کے اسباب پر جب آپ غور کریں گے تو اکثر واقعات میں دنیا کی محبت ہی سامنے آئے گی، اس لئے کہ جس کے دل میں دنیا کی محبت پیدا ہو جاتی ہے، اسے اندھا، بہرا بنا دیتی ہے، جس کی وجہ سے تمام برائیاں وجود میں آتی ہیں۔

ایک عبرت خیز حدیث:

یہیں سے وہ حدیث بھی سمجھ میں آجاتی ہے جس کو اللہ کے نبی ﷺ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:" مَا ذِئْبَانِ جَائِعَانِ أُرْسِلاَ فِي الْغَنَمِ بِأَفْسَدَ لَهَا مِنْ حِرْصِ الْمَرْءِ عَلَى الْمَالِ وَ الشَّرَفِ لِدِيْنِهِ "(دو بھوکے بھیڑئے جن کو بکریوں میں چھوڑ دیا گیا ہو وہ اس قدر ان بکریوں کو نقصان نہیں دیتے جتنا کہ آدمی کے اندر مال وجاہ کی حرص اس کے دین کو نقصان دیتے ہیں)(ترمذی:۲۳۷۶،مسند احمد:۳/۴۵۶،دارمی:۲/۳۹۴،صحیح ابن حبان:۸/۲۴)

اللہ اکبر! دنیا کی محبت وحرص اس قدر نقصان دہ ہے دین کے لئے کہ بھوکے بھیڑئے بھی بکریوں کے ریوڑ کو اس قدر نقصان نہیں پہنچا سکتے ،اور ظاہر ہے کہ یہ مختلف قسم اور مختلف انداز کے دینی نقصانات ہیں جو محبت دنیا کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

دنیا کا استعمال ضرورت کے لئے ہو:

لیکن یہاں ایک بات یاد رکھیں،وہ یہ کہ ایک ہے دنیا کا ضرورت کے لیے استعمال ، اور ایک ہے دنیا کی محبت میں گرفتار ہونا،ان دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ایک یہ ہے کہ آدمی ضرورت کے لیے دنیا کو استعمال کرتا ہے،کھانے کے لیے، پینے کے لیے، پہننے اور رہنے کے لئے،ان چیزوں کے لیے دنیا کو ضرورت کی خاطر استعمال کرتا ہے اور پھر اللہ کے حکم کے ماتحت استعمال کرتا ہے تو اس کا نام دنیا نہیں ہے، یہ دنیا کی محبت نہیں ہے، یہ دنیا کا استعمال ہے،اللہ نے دنیا اسی لیے تو دی ہے کہ ضرورت میں اس کو استعمال کرو۔

دیکھئے قرآن میں اللہ تعالی نے فرمایا:

﴿ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِىْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾ [الاعراف:۳۲] (اے نبی ﷺ ذرا پوچھئے کہ کس نے حرام کیا ہے اللہ کی زینت کو جس کو اللہ نے اپنے خاص بندوں کے لیے پیدا کیا ہے، اور رزق میں سے عمدہ چیزیں)

یہاں اللہ تعالی نے یہ فرمایا کہ "أخرج لعباده" یعنی دنیا کی زینت کو اللہ نے اپنے خاص بندوں ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ نے کافروں کے لیے پیدا نہیں کیا ہے، لہذا نیک بندوں کے علاوہ جو لوگ دنیا کو استعمال کرتے ہیں وہ دراصل غاصب ہیں، غصب کرکے اس کو استعمال میں لاتے ہیں، یہ نیک بندے اسے ضرورتاً استعمال کرتے ہیں اور دوسرے لوگ اسے دل سے لگا لیتے ہیں، اور یہی دل سے لگانا غلط ہے، اور ضرورت کے لیے استعمال کر لینا جائز ہے، جیسے ہم استنجاء کے لئے ڈھیلے لیتے ہیں، یہ ایک ضرورت ہے لہذا یہ جائز ہے، لیکن اگر کوئی ان ڈھیلوں کو مقصودِ زندگی بنالے اور ہر وقت اسی کی دھن وفکر میں لگا رہے تو یہ غلط بھی ہے اور بے وقوفی کی حرکت بھی۔

اسی لیے ساری دنیا کو ملعون قرار دیا گیا ہے، سوائے اس کے کہ اس دنیا کو دین کے لئے اختیار کیا جائے۔ ایک حدیث میں اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا:

"اَلدُّنْيَا مَلْعُوْنَةٌ وَمَلْعُوْنٌ مَا فِيْهَا اِلَّا ذِكْرُاللّٰهِ وَمَا وَالَاهُ وَعَالِمٌ وَمُتعلم" (دنیا ملعون ہے اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ بھی ملعون ہے، سوائے اللہ کے ذکر کے اور اس کے جو اللہ کے ذکر سے تعلق رکھنے والی ہو، اور عالم اور طالب علم کے) (ترمذی:۲۳۲۲)

جو اللہ والا ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ میرے دل میں یہ ملعون چیز کیوں رہے۔ چاہے

وہ جائز ہی کیوں نہ ہو، اور ذکر اللہ سے تعلق رکھنے والی چیزیں جیسے قرآن ہے حدیث ہے، علوم شرعیہ ہیں، مدارس ہیں، مساجد ہیں، مساجد سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں، علماء ہیں، طالب علم ہیں اور دینی خدام ہیں، یہ سب اس لعنت سے محفوظ ہیں۔

الغرض اپنی دینی و دنیوی ضرورتوں میں تو دنیا کا استعمال درست ہے، لیکن اسی کو مقصود بنالیا نا جائز نہیں، قابل ملامت کام ہے اور انسان کو لے ڈوبتا ہے۔

۞ دنیا کی مثال:

یاد رکھو کہ دنیا کو مقصود بنانے کے لئے نہیں، اس سے محبت کرنے کے لئے نہیں بلکہ ہماری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بنایا گیا اور ہمیں دیا گیا ہے، کیونکہ دنیا کے بغیر بھی تو ہم جی نہیں سکتے، نماز روزہ بھی نہیں کر سکتے، نیک کاموں میں خرچ کرنا چاہیں تو اس کے لئے بھی ہمیں دنیا کی ضرورت ہے، لہذا دنیا تو ضروت ہے، ہاں دنیا کی محبت خطرہ ہے۔

مثنوی شریف میں مولانا رومیؒ نے اس کی ایک مثال دی ہے، فرمایا جیسے کشتی ہوتی ہے کہ کشتی بغیر پانی کے کبھی چل نہیں سکتی، نیچے پانی ہونا ضروری ہے، لیکن وہ پانی جو کشتی چلانے کے لیے ضروری ہے، اگر وہ کشتی کے اندر آ جائے تو کشتی کو ڈبو کر رکھ دے گا، فرمایا کہ اسی طریقہ پر دنیا ضروری ہے آپ کے دین کی کشتی کو چلانے کے لیے، مثلاً آپ زکوۃ کیسے ادا کریں گے؟ مال ہے تبھی تو ہے زکوۃ، اسی طرح نماز پڑھنے کے لیے کپڑوں کی ضرورت ہے، نماز پڑھنے کے لیے مسجد کی ضرورت ہے، مسجد بنانے کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے، پیسے نہیں ہوں گے تو یہ سب چیزیں کیسے بنائیں گے، مدرسہ قائم کرنا چاہتے ہیں دین کی حفاظت واشاعت کے لیے تو اس کے لیے بھی پیسوں کی ضرورت ہے، غریبوں یتیموں کی امداد کیسے کریں گے؟

اس کے لئے بھی مال کی ضرورت ہے، تو دیکھئے دنیا کا ہونا دین کی کشتی کو چلانے کے لئے ضروری ہوا کہ نہیں؟ لیکن جب تک یہ مال پیسہ باہر باہر رہیگا، یہ دنیا ہاتھوں میں رہے گی، اس وقت تک دین کی یہ کشتی چلتی رہے گی، اور جس دن یہ مال کی محبت دل میں گھس جائے گی تو انسان کو اسی طرح ہلاک کر دے گی جیسے پانی کشتی میں داخل ہو کر کشتی والوں کو ڈبو کر ہلاک کر دیتا ہے، اس لئے اسے دل میں مت جماؤ، یہ بہت خطرناک چیز ہے۔

ایک بزرگ نے فرمایا کہ دنیا کو ایسا سمجھو جیسے استنجاء کے ڈھیلے کہ بڑے ضروری ہوتے ہیں، اسے ضرورت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اگر کوئی صاحب ان ڈھیلوں کو جمع کر کر کے الماری میں رکھا کریں، صندوق میں رکھا کریں تو آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ کہیں گے کہ اسے مینٹل (دماغی) ہسپتال میں داخل کرنا چاہئے، کیوں کہ ایک غیر ضروری چیز کو ضروری سمجھ کر استعمال کرنا بے وقوفی ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک غیر ضروری چیز کو ضروری چیز جیسا درجہ دیا جائے تو اس کا نام ہے پاگل پن۔

اس مثال کو سامنے رکھ کر ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ دنیا کے معاملے میں ہم نے اگر یہ کام کیا تو ہم بھی پاگل ہیں، خدا کی نظر میں اور رسول اللہ ﷺ کی نظر میں ان چیزوں کی حیثیت ان ڈھیلوں جیسی ہے۔

دنیا کی حقیقت، اکبر الہ آبادی کا واقعہ:

اکبر الہ آبادی کا ایک واقعہ یاد آ گیا کہ وہ ہندوستانی عدالت کے جسٹس تھے، ایک دفعہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ جو بہت پڑھے لکھے لوگ تھے، کسی خاص مسئلہ پر ایک کمرے میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے، اتنے میں ان کے والد جو بوڑھے تھے وہ کمرے میں داخل ہوئے اور ان کے ہاتھ میں ایک بیلون تھا، جسے غبارہ کہتے

ہیں، بچے ان میں پھونک مارتے اور ان سے کھیلتے اور ان کو پھوڑتے ہیں، وہ اندر آئے اور کہنے لگے بیٹا اکبر! یہ دیکھو تمہارے لیے کیا لایا ہوں؟ تم بچپن میں اسے بہت پسند کرتے تھے، اور رُو رُو کر اسے مانگا کرتے تھے۔ لہٰذا یہ غبارہ رتمہارے لئے لایا ہوں۔

بس جناب یہ سننا تھا کہ اکبر الہ آبادی کے اوپر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ اسے بیان نہیں کیا جاسکتا، نہایت شرمندہ ہوگئے کہ ایک چیف جسٹس اور ان کے ساتھ بڑے بڑے لوگ بیٹھے ہیں، ان کے سامنے والد صاحب غبارہ لا کر دے رہے ہیں کھیلنے کے لیے، کتنی شرم کی بات ہے، وہ بہت ہی شرمند ہوگئے۔ اکبر الہ آبادی کے چہرہ پر شرمندگی کے آثار جو نمایاں تھے، اسے دیکھ کر ان کے والد نے کہا کہ بیٹا! مجھے احساس ہے کہ غبارہ کے دیکھنے سے اس وقت تمہیں شرمندگی محسوس ہورہی ہے، لیکن میں تم کو اور تمہارے ان ساتھیوں کو ایک بات سمجھانے کے لیے آیا ہوں۔ وہ یہ کہ تم جو آج ان عہدوں اور دولت کی چیزوں پر فخر کر رہے ہو، اور ان کو حاصل کرنے کی فکر کرتے ہو، کل قیامت کے دن وہی چیز تم کو دی جائے گی تو وہاں بھی تم کو اسی طرح شرم آئے گی، جیسے آج تمہارے بچپن کی خواہشات ومطالبات پر شرم آرہی ہے۔

اللہ اکبر! کتنا بڑا سبق پڑھا دیا اس معمولی سے واقعہ سے! یہ بلڈنگ آج ہمیں اچھی لگتی ہیں، دنیا کا پیسہ بہت اچھا لگتا ہے، بلکہ آدمی اسے دوسروں سے چھیننا چاہتا ہے، اس کو جمع کرنا چاہتا ہے، اس کو بڑھانا چاہتا ہے، بڑی فکریں اس کے لیے کرتا ہے، اپنی نیند قربان کرتا ہے، اپنی جان قربان کرتا ہے۔

لیکن اللہ تعالی قیامت کے دن جب انسان کو یہ دولت دیں گے تو اسے وہاں شرم آئے گی، اس لئے کہ وہاں اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہوگی۔

زمین اپنے خزانے اگل ڈالے گی:

آخرت میں کیا، دنیا ہی میں ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ زمین اپنے خزانے اگل ڈالے گی مگر اسے کوئی لینے والا نہیں ہوگا۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”زمین اپنے جگر کے ٹکڑے یعنی سونا وچاندی کے خزانے اگل ڈالے گی، اس واقعہ سے پہلے ایسا ہوا ہوگا کہ اسی مال کی خاطر ایک بھائی نے اپنے بھائی کو قتل کردیا ہوگا، کسی نے اسی کے لئے اپنے رشتے ناتے توڑے ہوں گے، کسی نے اس کی خاطر چوری کی ہوگی اور اس کے ہاتھ کاٹے گئے ہوں گے، اب لوگ اس مال کو لات مارتے ہوئے جائیں گے، کوئی اس کو اٹھانے والا نہیں ہوگا، تو وہ قاتل کہے گا کہ ” فِيْ هذا قَتَلْتُ “(اسی کے لئے میں نے قتل کیا تھا)، اور رشتہ توڑنے ولا آئے گا اور کہے گا ” فِيْ هذا قَطَعْتُ “(اسی کی خاطر میں نے رشتہ توڑا تھا، اور چور آئے گا اور کہے گا ” فِيْ هذا قُطِعَتْ يَدِي “ (اسی کی وجہ سے میرے ہاتھ کاٹے گئے) مگر یہ لوگ اس میں سے کوئی چیز نہیں لیں گے)۔ (مسلم:۱۰۱۳، ترمذی:۲۲۰۸، صحیح ابن حبان:۱۵/۹۰، مسند ابویعلی:۱۱/۳۲)

قرآن میں بھی اس کا ذکر موجود ہے:

﴿ إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا﴾ [الزلزال:۱-۲] (جب زمین کو زلزلہ آئے گا، اور زمین اپنے خزانے اگل ڈالے گی)

اس میں قیامت کے زلزلہ کا ذکر ہے اور اس وقت زمین کے خزانے اُگلنے کا تذکرہ کیا گیا ہے اور حدیث میں اس سے بھی پہلے ہونے والے واقعہ کا ذکر ہے۔

دنیا کی حقیقت پر ایک عجیب قطعہ:

حیدرآباد میں ایک شاعر امجد حیدآبادی گزرے ہیں، ان کے اشعار بہت پر مغز وحقیقت نما ہوتے ہیں، دنیا کی حقیقت پر ان کا قطعہ یاد آگیا:

دنیاوالوں ثبات دنیا میں نہیں ☆ یک لحظہ قرار موج دریا میں نہیں
عالم کا وجود صورت ''لا'' سمجھو ☆ لفظاً موجود معنی میں نہیں

یعنی یہ کہتے ہیں کہ جیسے دریا میں ہر وقت تحریک رہتی ہے، ادھر سے ادھر وہ موجیں مارتا رہتا ہے، اسی طرح پوری دنیا میں یہی حال ہے، کسی چیز کو قرار نہیں، کوئی مر رہا ہے، کوئی جی رہا ہے، ادھر دیکھو تو خوشیاں ہیں، ادھر دیکھو تو غمیاں ہیں، کوئی صحت مند ہو رہا ہے، کوئی مریض ہو رہا ہے، کوئی مالدار ہو رہا ہے، کوئی غریب ہو رہا ہے۔ یہ ہے دنیا کا نقشہ، پھر شاعر نے اس بے ثباتی سے اس کی بے حقیقتی پر استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ دیکھو ''لا'' لکھتے اور بولتے ہیں، لا کے معنی ہیں ''نہیں''، جیسے کہتے ہیں ''لا الہ'' (نہیں ہے کوئی معبود) یہ ''لا'' لفظاً تو موجود ہے، لکھا جاتا ہے، بولا جاتا ہے، پڑھا جاتا ہے، پڑھایا جاتا ہے،، لیکن اس کے معنی ہیں ''نہیں''، یہ صورت میں تو موجود ہے معنی میں نہیں، اسی طرح یہ پورا عالم دیکھنے میں تو ہے، معنی میں کیا ہے؟ کچھ نہیں۔ کیا عجیب مثال دی، دیکھنے میں سورج بھی نظر آرہا ہے، چاند بھی نظر آرہا ہے، بظاہر سب کچھ موجود ہے، حقیقت میں کچھ نہیں۔

الغرض دنیا کی بے حقیقتی و بے ثباتی سے عبرت لیتے ہوئے انسان کو چاہئے کہ وہ اس سے کنارہ کش ہو اور اس کے پیچھے نہ پڑے اور ہر وقت اسی کی دھن وفکر میں نہ رہے اور اسی کے لئے جینے اور مرنے کا نظریہ چھوڑ دے۔

طہارت کی چوتھی قسم:

اب لیجئے چوتھی قسم کی طہارت کو، یہ طہارت بڑی عجیب وغریب ہے، کمال درجہ کی طہارت ہے اور اس کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے، سب سے اونچا درجہ ہے، اور یہ مخصوص بندوں اور اللہ کے مقرب بندوں کا حصہ ہے، اللہ کسی پر فضل کرے تو اس کو وہ دولت مل سکتی ہے، حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کو اور پھر اس کے بعد انہیں کی تبعیت اور انہیں کی وراثت اور طفیل میں اولیاء اللہ کو اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے۔

یہ عظیم الشان طہارت کیا ہے؟ وہ ہے اپنے دل کو اللہ کے ماسوا تمام چیزوں سے خالی اور پاک کر لینا، اس لیے کہ جو کچھ دنیا کی چیزیں ہم کو نظر آتی ہیں، یہ حقیقت میں گندگی ہیں، اللہ پاک ہے اور اللہ کی پاکی کے سامنے دنیا کی ہر چیز بالکل ناپاک ہے، اس لئے دنیا کی ان تمام چیزوں سے اپنے دل کو پاک وصاف کر کے اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی محبت کو سما لینا، اللہ کے عشق کو بسا لینا، دل میں کچھ نہ رہے صرف اللہ رہے اور ساری چیزیں نکل جائیں، یہ سب سے اعلی درجے کی پاکی وطہات ہے۔

اب جو اچھی چیزیں ہیں، جو جائز چیزیں ہیں، وہ بھی اس کے دل میں نہیں رہیں گی، دنیا کی کوئی خواہش، دنیا کی کوئی تمنا، دنیا کی کوئی آرزو، دنیا کی جائز خواہشیں سب اس سے نکل جائیں گی، صرف دل میں اللہ ہی اللہ رہے گا۔

خواجہ مجذوب صاحب کا ایک شعر:

حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحبؒ نے اپنے ایک شعر میں طہارت کے اسی مقام کا ذکر کیا ہے کہ ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

خواجہ صاحب نے اس میں اللہ سے خطاب کیا ہے کہ اے میرے مالک! اب دل میں کوئی تمنا نہیں ہے، کوئی خواہش نہیں ہے، کوئی آرزو نہیں ہے، اب دل خالی ہو چکا ہے، خلوت کے معنی ہیں سب چیزوں سے دل خالی ہو گیا، حرص سے ہوس سے دل خالی ہو گیا، لہٰذا اب یہ دل تیرے قابل بنا چکا ہوں، اب اس میں صرف تیری ہی جلوہ نمائی ہوسکتی ہے، اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی۔

ہمارے حضرت مسیح الامتؒ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ نے تمام اعضاء دو دو دیے ہیں، دو ہاتھ ہیں، دو پیر ہیں، دو آنکھ ہیں، لیکن بھائی اللہ نے دل ایک دیا ہے اور زبان ایک دی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس ایک دل کے اندر صرف میری گنجائش ہونی چاہئے اور کسی کی نہیں، اور اس زبان میں صرف میرا ذکر ہو اور کسی کا نہیں، زبان میں میرا ذکر ہو دل میں میری یاد ہو۔

مقصدِ تخلیق معرفت و محبت حق ہے:

کیونکہ ہماری تخلیق کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہم اللہ کی معرفت و محبت اپنے اندر پیدا کریں، ایک حدیث قدسی میں آیا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "كُنتُ كَنزاً مَخفِياً فَأَحبَبتُ أَنْ أُعرَفَ فَخَلَقتُ الْخَلقَ" (میں ایک مخفی خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ میری معرفت ہو، میری پہچان ہو تو میں نے مخلوق کو پیدا کیا)

یہ حدیث محدثین کے نزدیک لفظاً ثابت نہیں ہے لیکن وہ حضرات کہتے ہیں کہ

اس کا معنی و مفہوم دیگر احادیث و دلائل سے ثابت ہے۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ کو جاننے والا نہیں تھا، نہ یہ آسمان موجود تھا، نہ یہ زمین موجود تھی، نہ یہ ستارے موجود تھے، نہ یہ انسان موجود تھا، سب کی سب چیزیں معدوم تھیں، کوئی چیز موجود نہیں تھی، صرف اللہ کی ذات موجود تھی، اس مخلوق کو پیدا کر کے اللہ نے کیا چاہا؟ اللہ کو پہچانو، اللہ سے محبت کرو، اللہ میں غور کرو، یہ جتنی مخلوقات ہیں ان کو دیکھ کر مخلوق کو نہیں، بلکہ دراصل خالق کو پہچانو، مخلوقات تو ذرائع ہیں، وسائل ہیں، اسباب ہیں، لیکن ان سب چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا ہے، زمین کو دیکھ کر، آسمان کو دیکھ کر، سورج کو دیکھ کر، چاند کو دیکھ کر، انسان کو دیکھ کر، انسان کے اندر کی چیزوں کو دیکھ کر، اس کے اندر کی خصوصیات و کمالات کو دیکھ کر، ان سب چیزوں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اللہ تعالیٰ کی محبت اپنے قلب کے اندر پیدا کرنا مقصود ہے۔

اس کے لیے اللہ نے اس کائنات کو اور اس کے ذرے ذرے کو پیدا کیا، معلوم ہوا کہ انسان کو پیدا کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرے، اللہ سے محبت کرے، اس کے علاوہ کوئی اور مقصد نہیں ہے، لیکن انسان دنیا میں آنے کے بعد دنیا کی حقیر اور فانی چیزوں سے دل لگا لیتا ہے، اور انہی کو اپنا مقصود و قبلہ سمجھتا ہے۔

تو بھائیو! بتانا یہ چاہتا ہوں کہ دل کو پاک وصاف کرنے کے بعد مقصود یہ ہے کہ اس دل کے اندر خدا کی محبت سمائی اور بسائی جائے۔

۞ چاروں طہارتیں مل کر آدھا ایمان کیوں ہیں؟

الغرض اسلام میں طہارت و پاکی کا جو تصور ہے وہ ان سب امور و اقسام کے

لحاظ کے ساتھ میں ہے، جب ہم اس کو اس طرح سمجھیں گے تو اس حدیث پر کوئی اشکال واعتراض نہیں ہوگا کہ اللہ کے نبی ﷺ نے صرف طہارت کو کیسے آدھا ایمان قرار دیدیا؟ ظاہر ہے کہ جب اس تفصیل کے ساتھ طہارت کو سمجھا جائے گا اور اس کی ان قسموں کو ملحوظ رکھا جائے گا تو کیا اشکال کی گنجائش ہے؟

اب رہا یہ سوال کہ یہ چاروں طہارتیں مل کر آدھا ایمان کیوں ہیں؟ میرے ذہن میں اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ ایمان کی تکمیل کے لیے دو چیزیں چاہئیں: ایک اوامر یعنی جن چیزوں کو کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جیسے نماز ہے، روزہ ہے، حج ہے، قربانی ہے، زکوۃ ہے وغیرہ، ان کی بجا آوری وتعمیل، اور ایک نواہی یعنی جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے، ان سے دوری و پرہیز، اب غور کریں کہ پاکی وطہارت میں وہ تمام چیزیں داخل ہیں جن سے پرہیز کا حکم ہے اور وہ تمام قسم کی برائیاں ہیں، ظاہری بھی اور باطنی بھی، لہذا تمام حرام وناجائز اور بری باتوں سے بچنا ہی پاکی وطہارت ہے، تو یہ آدھا ایمان ہو گیا اور باقی آدھا ایمان اوامر ونیکیوں کی بجا آوری میں ہے، اس طرح طہارت آدھا ایمان قرار پاتا ہے۔

تو ماموارت کو پورا کرنا آدھا ایمان، اور ممنوعات سے بچنا آدھا ایمان، دونوں کو ملائیں تو مکمل ایمان ہو گیا۔

پہلے تخلیہ پھر تحلیہ:

اب ایک اور نکتہ سنئے، وہ یہ کہ اسلام میں پاکی کو تمام عبادات پر مقدم رکھا گیا ہے، ظاہری پاکی بھی مقدم ہے اس کے بعد نماز وعبادت ہے، اگر کوئی بے وقوف پہلے نماز پڑھ لے اور بعد میں پاکی حاصل کرے تو یہ غلط اور حماقت ہے، اسی طرح نیکیاں وخوبیاں اپنے اندر پیدا کرنے سے پہلے اپنے اندر سے برائیوں وظاہری

وباطنی گندگیوں کو دور کرنا بھی ضروری ہے۔ حضور ﷺ نے پہلے یہ فرما کر کہ طہارت آدھا ایمان ہے، ہمیں پہلے ممنوعات و گناہوں سے بچنے کا حکم دیدیا، اس لیے کہ جب انسان کسی جگہ پر بلڈنگ بنانا چاہتا تو سب سے پہلے وہاں کے جھاڑ جھنکار پاک وصاف کرتا ہے، گندگی ہوتو اسے ہٹاتا ہے، زمین ہموار کرتا ہے، پھراس کے بعد وہاں تعمیر کرتا ہے۔ اسی طرح ایمان کی عمارت تعمیر کرنے کے لیے گناہوں اورنواہی کے جھاڑ جھنکاراور گندگی وآلودگی کو پہلے صاف کرنا پڑے گا، جب دل کی جگہ پاک وصاف ہوجائے گی تو پھرایمان کی عمارت تعمیر ہوگی، پھرنماز کے ذریعہ، ذکر کے ذریعہ، تلاوت کے ذریعہ، دیگرعبادات کے ذریعہ ایمان کی عمارت تعمیر ہوگی، اگر پاکی وصفائی کے بغیرعمارت تعمیر کردی گئی تو عمارت تو بن جائے گی، لیکن اس کے اندر نقص وکھوٹ رہ جائے گا۔

اسی کوحضرات صوفیاء کرام تخلیہ وتحلیہ سے تعبیر کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ پہلے تخلیہ یعنی صفائی و پاکی ہوگی، اس کے بعد پھرتحلیہ یعنی اس کوآراستہ پیراستہ کیا جائے گا اورسنوارا جائے گا۔

چوتھادرجہ بطورانعام دیاجاتاہے:

میرے بھائیو! جب بندہ پاکی کے پہلے تین درجات کوحاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اوراس کے اندراسے کامیابی مل جاتی ہے تو چوتھادرجہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطورانعام دیاجاتا ہے۔

جیسے بچہ تعلیم میں محنت کرتا ہے تواس سے کہا جاتا ہے کہ اگرتم نے اتنی محنت کی تو تم پاس ہوجاؤ گے، لیکن بچہ جب پاس ہوجاتا ہے تو اسے انعام دیا جاتا ہے۔ پاس ہونا تواس کی محنت کا نتیجہ ہے، انعام کا دیاجانا دراصل استاذوں کی طرف سے

بطور تحفہ اور عنایت کے ہوتا ہے۔اسی طریقہ پر جب بندہ اپنے ظاہر و باطن کی صفائی کے لئے محنت کرتا ہے، کوشش کرتا ہے تو یہ تین درجے اس کی محنت کے نتیجے میں اس کو دیے جاتے ہیں اور کامیابی کا رستہ اس کے لیے کھول دیا جاتا ہے اور چوتھا درجہ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل سے، اپنے کرم سے، اپنے احسان سے عطاء فرماتے ہیں۔

لہٰذا آدمی کو چاہیے کہ ان تین درجات کی تحصیل کے لیے خوب کوشش کرے، اتنی کوشش، لگن اور محنت ہو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے چوتھی چیز بطور عنایت اور بطور تحفہ اس کو دے دی جائے۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو محض اپنے فضل و کرم سے تمام قسم کی پاکیوں اور طہارتوں سے مالا مال فرمائے اور اپنی رحمت و مغفرت کا حصہ عطاء فرما دے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰه رب العالمين

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محبت الٰہیہ اور اس کے آثار ولوازم

الحمد للّٰه رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین،أما بعد فأعوذ باللّٰه من الشیطان الرجیم، بسم الله الرحمن الرحیم :

﴿وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا أَشَدُّ حُبّاً لِلّٰہِ﴾

تمام عرفانی مقامات میں سب سے بلند وعظیم مقام ’’محبت الٰہیہ‘‘ کا ہے، اس کے اول وآخر جو کچھ ہے وہ یا تو اس کا مقدمہ ہے یا نتیجہ وثمرہ ہے۔ جیسے توبہ، صبر اور زہد، توکل، وغیرہ مقامات ’’محبت الٰہیہ‘‘ کا مقدمہ ہیں کہ اس کی تحصیل ان پر موقوف ہے۔ اور شوق، انس، رضا وغیرہ مقاماتِ عرفانی اسی محبت الٰہیہ کا ثمرہ اور نتیجہ ہیں، کہ جس کسی کو بھی محبت الٰہیہ کا ادراک ہوگا وہ ضرور ان مقامات کو بھی حاصل کرے گا۔

غرض یہ کہ ’’محبت الٰہیہ‘‘ وہ بلند ترین وعظیم الشان روحانی وعرفانی مقام ہے کہ اس سے بلند وعظیم کوئی مقام نہیں اور معرفتِ الٰہیہ جو کہ مقصدِ تخلیقِ انسان ہے، اس کے بغیر ممکن نہیں۔

❁ اللہ تعالیٰ ہی محبوب حقیقی ہے:

غرض یہ کہ ایمان کے لیے اللہ تعالیٰ سے محبت لازم ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارا محبوب حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اور جو دنیوی محبتیں ہیں وہ محض فانی ہیں اور مجازی ہیں کیوں کہ جن جن خوبیوں اور کمالات کی وجہ سے انسان دوسرے انسانوں سے اور چیزوں سے محبت کرتا ہے وہ ساری خوبیاں اور کمالات ان انسانوں اور

چیزوں میں ان کے ذاتی اور خانہ ساز نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے ہیں، پھر یہ ساری دنیوی خوبیاں اور کمالات فنا کے گھاٹ اتر جانے والے ہیں، اس لیے ان سے کیا محبت کی جاسکتی ہے۔

ہاں حقیقی معنی میں محبت تو صرف اللہ تعالیٰ سے ہوسکتی ہے، یا ان ہستیوں سے جن کا اللہ تعالیٰ سے تعلق ہو۔ جیسے انبیاء علیہم السلام واولیاء کرام اور علماء عظام جن کے ذریعہ ہمیں اللہ کی معرفت ومحبت نصیب ہوتی ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے سارے کمالات اس کے اپنے ذاتی ہیں اور وہ ان کمالات سے ہمیشہ سے متصف ہے اور ہمیشہ متصف رہے گا۔

کائنات فانی ہے، حضرت ابراہیم کا واقعہ:

اور دنیا کی چیزوں کو اس لیے بھی دل سے نکالنا ہے کہ ان کے اندر اگر کوئی عیب نہیں ہے تو ایک عیب ضرور ہے، وہ یہ ہے کہ وہ فانی ہیں۔ چلئے مان لیا کہ سورج ماشاء اللہ بہت بہترین ہے اور نہایت حیرت انگیز ہے، لیکن سب کچھ ہونے کے باوجود بھی فانی ہے، ختم ہوجانے والا ہے، ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے لوگوں کی اصلاح کے لیے ایک دفعہ ایسا کیا کہ آپ باہر تشریف لائے اور اس وقت آسمان پر ستارے نکلے ہوئے تھے، اوپر دیکھا ستاروں کی طرف کہ ماشاء اللہ ٹمٹمارہے ہیں،— دیکھنے میں تو ٹمٹمارہے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ بہت بڑے بڑے ہیں، بہت دوری پر ہونے کی وجہ سے وہ ہمیں ایسے نظر آتے ہیں گویا ٹمٹمارہے ہیں— تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو دیکھ کر کہا " هٰذا رَبِّیْ " کہ یہ میرا رب ہے، یہ حضرت ابراہیم نے لوگوں کو سمجھانے کے لیے کہا تھا، ایسا نہیں کہ وہ نعوذ باللہ ان کو رب مان رہے تھے، نبی

تو کوئی گناہ بھی نہیں کرسکتا، شرک کیسے کرسکتا ہے، کیونکہ جمہور علماء کا مذہب ہے کہ انبیاء قبل از نبوت اور بعد از نبوت معصوم ہوتے ہیں۔

خیر کچھ دیر کے بعد جب ستارے چھپنے لگے، غائب ہونے لگے، تو ابراہیم علیہ السلام نے لوگوں کی عقلوں کے مطابق ان کو سمجھانے کے لیے فرمایا کہ " اِنِّیۡ لَا اُحِبُّ الۡاٰفِلِیۡنَ" کہ یہ ختم ہوجانے والوں، غروب ہوجانے والوں، غائب ہوجانے والوں کو میں پسند نہیں کرتا، ان کو خدا کیسے بنالوں، خدا تو وہ ہوتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا دنیا کو اور دنیا کی ان چیزوں کو ثبات کہاں ہے؟ ثبات تو صرف اللہ کو ہے۔

پھر کسی موقعہ پر حضرت ابراہیم باہر نکلے تو دیکھا کہ چاند نکلا ہوا ہے، بہت خوب اس کی روشنی پھیلی ہوئی ہے، کہنے لگے "ھذا رَبِّیۡ" کہ یہ میرا رب ہے، ارے وہ ستارے تو خدا نہیں ہوسکتے تھے، کیونکہ وہ غروب ہوگئے، مگر یہ تو ہے خدا، یہ تو بہت چمک دار ہے، بڑا حسین ہے، بڑا جمیل ہے، دنیا بھر کو روشنی دے رہا ہے۔ اس کے بعد وہ بھی غروب ہوگیا، تو کہنے لگے، یہ بھی میرا خدا نہیں ہوسکتا۔

پھر سورج کو دیکھ کر کہنے لگے کہ یہ میرا خدا ہے، اور سب سے بڑا بھی ہے، دیکھو وہ سارے عالم کو اس طرح منور کیے ہوئے ہے کہ ذرہ ذرہ اس سے روشن ہے۔ کہنے لگے " ھذا رَبِّیۡ ھٰذَاۤ اَکۡبَرُ" کہ یہ میرا رب ہے، یہ بہت بڑا ہے، لیکن ظاہر بات ہے کہ صبح میں نکلا ہوا سورج شام میں غروب تو ہوتا ہی ہے، جب وہ بھی شام میں غروب ہوگیا تو حضرت ابراہیم نے لوگوں کو سمجھانے کے لیے فرمایا کہ دیکھو یہ بھی خدا نہیں ہے جو ختم ہونے والا ہے، دنیا کی چیزوں پر حالات طاری ہوتے ہیں، حوادث پیش آتے ہیں، اس لیے یہ خدا نہیں ہوسکتے، خدا تو باقی رہنے والا ہے۔ تو یہ

حضرت ابراہیم کی ایک تدبیر تھی مشرکین کو سمجھانے کے لیے کہ ایک اللہ کی عبادت کرو، اسی سے دل لگاؤ۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ عیب فنا ہونے کا تو سب مخلوقات کے اندر ہے کہ سب کے سب فنا کے گھاٹ اترنے والے ہیں۔ مثلاً انسان ہے، کتنے دن جیئے گا؟ آخر کار ختم ہو جائے گا، عورت ہے، کتنے دن جیئے گی، ایک نہ ایک دن مرجائے گی، حسن ہے کب تک رہے گا، کبھی نہ کبھی ختم ہو جائے گا۔

❁ فنا سب سے بڑا عیب، سلیمان بن عبدالملک کا واقعہ:

اس پر ایک واقعہ یاد آ گیا، سلیمان بن عبدالملک کا نام آپ نے سنا ہوگا، بہت بڑا بادشاہ تھا، امیر المؤمنین تھا، جوانی میں اللہ نے اس کو بادشاہت دیدی تھی، بڑا ذی وجاہت بھی تھا اور حسین وجمیل بھی تھا، ایک دن اس نے اپنے آپ کو خوب اچھی طرح سنورا، بنایا، بہترین کپڑے پہنے، عمامہ زیب تن کیا، خوشبوئیں لگایا، بہت ساری چیزوں سے اپنے آپ کو آراستہ پیراستہ کیا، اور خدا کی نوازش سے حسین و خوبصورت بھی تھا۔

اس کے بعد اپنے دربار میں رونق افروز ہوا، اور اپنے آپ پر وہ پھولے نہیں سما رہا تھا، سب لوگ دیکھ کر اس کی تعریف کرنے لگے، اتنے میں اس کی ایک باندی آئی جب باندی آئی تو اس نے باندی کو دیکھکر مسکرایا اور پھر اس کے بعد کہا کہ میں کیسا لگ رہا ہوں، تو باندی نے اس کے جواب میں فی البدیہہ عربی میں دو شعر کہے ؎

أَنْتَ نِعَمَ الْمَتَاعُ لَوْ كُنْتَ تَبْقٰى

غَيْرَ أَنْ لَّا بَقَاءَ لِلْإِنْسَانِ

أَنْتَ خِلْوٌ مِّنَ الْعُيُوْبِ وَ مِمَّا
يَكْرَهُ النَّاسُ غَيْرَ أَنَّكَ فَانٍ

عجیب اشعار کہے اس نے ،ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ اس نے بادشاہ سے کہا کہ اے کاش کہ اگر آپ باقی رہنے والے ہوتے تو آپ بہت ہی بہترین چیز تھے، لیکن کیا کروں کہ کسی بھی انسان کو بقاو دوام ہے ہی نہیں،سب فنا ہونے والے ہیں،آپ کے اندر کوئی عیب نہیں ہے،سارے ان عیبوں سے آپ پاک ہیں، خالی ہیں،اور ان سب باتوں سے بھی پاک ہیں جن سے لوگ نفرت کرتے ہیں اور برا سمجھتے ہیں،لیکن ایک عیب ہے آپ کے اندر، وہ یہ کہ آپ فانی ہیں)

دیکھئے!اس باندی نے حقیقت کو سمجھا اور حقیقت کو اس کے سامنے بیان کردیا کہ آپ میں بڑے کمالات وخوبیاں ہیں مگر یہ کیا کم عیب ہے کہ آپ مرجانے والے ہیں،اگر باقی رہتے تو واقعی عشق کے قابل تھے، دل لگانے کے قابل تھے،محبت کرنے کے قابل تھے،تعلق کرنے کے قابل تھے،لیکن آپ کے اندر فنا کا ایک عیب ایسا ہے جس نے ساری خوبیوں پر پانی پھیر دیا،بس یہ کہنا تھا کہ اس کے اوپر عجیب کیفیت طاری ہوگئی، اسکے بعد اس نے مجلس برخواست کردی، اور باندی کو اپنے کمرہ میں بلایا،اور بلا کر کہا کہ تو نے میرے بارے میں یہ کیوں کہا؟ تو اس نے معذرت کی اور کہا کہ مجھے جو حقیقت سمجھ میں آئی اس کو میں نے بیان کردیا،اس کے بعد اس نے اس کو انعام بھی دیا اور کہا کہ میری آنکھیں تو نے کھول دیں۔اسی کے چند دن کے بعد اس کا انتقال ہوگیا، جوان ہی تھا جوانی ہی میں اس کی وفات ہوگئی۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ یہ دنیا کیسی ہی خوبیوں کی مالک کیوں نہ ہو،لیکن اس کے اندر یہ عیب تو ہے ہی کہ یہ تو فنا ہونے والی ہے۔سورج سے کیا دل لگانا، چاند سے

کیا دل لگانا، آسمان سے کیا دل لگانا، زمین سے کیا دل لگانا، عورت سے کیا دل لگانا۔ یہ تو دل لگانے کے قابل نہیں، بلکہ دل سے نکالنے کے قابل ہیں، دل لگانے کے قابل اور محبت کرنے کے قابل تو صرف اللہ کی ذات ہے، جس کو کبھی فنا نہیں ہے، جس میں کوئی عیب نہیں ہے، جو "المستجمع لجميع صفات الكمال" (ساری خوبیوں کا جامع) ہے۔

اللہ کی اور غیر اللہ کی محبت کا اجتماع ناممکن، سمنون محبؒ کا واقعہ:

یاد رکھئے کہ جب تک دنیا کی محبت اس دل میں گھسی رہے گی، اللہ تعالیٰ کی محبت بالکل نہیں آسکتی، دو چیزوں میں تضاد ہے، اللہ کی محبت اور غیر اللہ کی محبت میں۔

حضرت سمنون محبؒ بہت بڑے اللہ کے ولی گزرے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک عورت سے نکاح کیا، اس شرط پر کہ وہ دین پر قائم رہے گی، شریعت کے اوپر چلتی رہے گی، نکاح ہوگیا، اس سے مجھے ایک بچی پیدا ہوئی، بچی بڑی پیاری تھی، اس لیے میرا دل اس بچی میں لگ گیا، میں بار بار اس کی طرف دیکھتا اور اسی میں مشغول رہنے لگا، اس بچی کی محبت نے میرے اوپر غلبہ پالیا اور جو اللہ تعالیٰ کی محبت کی کیفیت دل میں پاتا تھا اس میں کمی ہونے لگی، پہلے تو اللہ کی محبت ایسی گھسی ہوئی اور بسی ہوئی تھی کہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔

حضرت سمنون فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ! میں دل کے اندر محسوس کرتا ہوں کہ تیری محبت میں کمی ہو رہی ہے، مجھے بتادے کہ یہ کیوں ہو رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ رات سویا تو خواب کے اندر دیکھا کہ ایک ابر کا سایہ ہے، اس کے اندر بڑی ٹھنڈک معلوم ہو رہی ہے اور ایک نورانیت ہے، بہت سارے لوگ اس کے اندر جمع بیٹھے ہیں، میں نے خواب ہی میں کسی سے پوچھا کہ لوگ کیوں بیٹھے

ہیں،اور یہ کون لوگ ہیں؟ توانہوں نے کہا کہ یہ عشاقِ خداوندی ہیں، عاشقان الٰہی ہیں، اللہ تعالیٰ کی محبت میں چوراور سرشار لوگ ہیں، یہ یہاں پر جمع ہیں، کہتے ہیں کہ میں بھی جا کران لوگوں میں بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا ،تو ایک آدمی آیااور میرا ہاتھ پکڑ کراس نے مجھے باہر کردیا، میں نے کہا کہ بھائی ! میں بھی ان لوگوں میں شامل ہوں، میں بھی اللہ سے محبت کرتا ہوں، میں بھی اللہ کی محبت میں سرشار رہتا ہوں، مجھے بھی ان میں بیٹھنے دے،تو وہ کہنے لگا کہ نہیں، تو ان میں داخل نہیں ہے،اس لیے کہ تیرے دل میں تو تیری بچی کی محبت ہے، کہتے ہیں کہ میں نے خواب ہی میں پھر اللہ تعالیٰ سے دعامانگی۔

دعا یہ کی کہ اے اللہ! اگر اس لڑکی کی محبت نے تیری محبت کو میرے دل سے قطع کردیاہے تو اس کی مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے، اس لیے اے اللہ! تیری محبت دے کر اس کی محبت کو نکال دے۔ کہتے ہیں کہ میں نے یہ دعا کی خواب ہی میں، تو خواب ہی میں میں دیکھ رہاہوں کہ عورتوں کے رونے کی آواز آرہی ہے۔ اتنے میں میری آنکھ کھل گئی، آنکھ کھلی تو دیکھا کہ واقعی عورتیں رورہی ہیں، میں نے پوچھا کہ کیابات ہوگئی؟ تو کہا کہ بچی اوپر چڑھی تھی، ابھی گر کر مرگئی۔

اللہ اکبر! بڑا عبرت ناک واقعہ ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے ایسے عشاق تھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے کہا:﴿ وَالَّذِيْنَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبّاً لِّلّٰهِ﴾ (ایمان والے اللہ سے شدید محبت کرتے ہیں) اس میں ذراسی کمی انہوں نے محسوس کی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ التجاء کی۔

آج ہم لوگ غور کریں کہ ہمارے دل میں کتنے لوگوں کی محبت ہے، بے شمار چیزوں کی محبت ہے،اورصرف محبتیں نہیں ہیں، بلکہ غالب محبتیں ہیں، اللہ کی محبت

کہیں ایک کونے میں پڑی ہوئی ہے،اوراس کا کوئی احساس بھی ہم کونہیں ہورہا ہے،اوراس احساس کے نہ ہونے کی وجہ سے اسکے کوئی آثار بھی ہمارے اوپر مرتب ہوتے دکھائی نہیں دیتے ،اور یہ حضرات ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں چور ہیں، سرشار ہیں،اوراس کے اندرذراسی کمی محسوس ہورہی ہے تو اللہ تعالیٰ سے درخواست ہورہی ہے کہ اے اللہ ایسا کیوں؟ اللہ تعالیٰ نے اس کی وجہ بتائی۔

دعاء محبت کی تشریح:

نبی اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے بہت ساری دعائیں مانگی ہیں،ان میں سے ایک دعاء یہ ہے کہ آپ ﷺ دعاء میں فرماتے ہیں ”اَللّٰھُمَّ اجْعَلُ حُبَّكَ أَحَبَّ إِلَیَّ مِنُ نَفُسِیُ وَ أَھُلِیُ وَمِنَ الُمَاءِ الُبَارِدِ“(اے اللہ! مجھے آپ کی محبت میرے نفس سے بھی زیادہ عطافرما،اورمیرے اہل وعیال سے بھی زیادہ عطافرما،اورٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ محبت عطافرما)(ترمذی:۳۴۹۰)

یہ دعاء ودرخوست محبت ہے، کہ اللہ تعالی سے نبی کریم ﷺ محبت کا سوال کررہے ہیں، مگرسوال کا انداز دیکھئے کہ کس قدر نرالا ہے؟ ہرآدمی کواپنی جان بڑی محبوب ہوتی ہے،اسی لیے اپنی جان کی حفاظت کرتا ہے،اوراپنی جان کے ساتھ بڑااچھا سلوک کرتا ہے، جوجی میں آتا ہے اس کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کواپنی جان محبوب ہے۔اللہ کے نبی ﷺ کہتے ہیں کہ اے اللہ! مجھے میری جان سے بھی زیادہ آپ کی محبت دے دیجئے،اللہ کے رسول ﷺ کا یہ سوال اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کے نزدیک یہ مطلوب ہے،اوررسول اللہ ﷺ کے نزدیک یہ مطلوب ہے کہ اللہ کی محبت اپنی جان سے بھی زیادہ ہو۔

ظاہر ہے کہ اگر یہ مطلوب نہ ہوتا تو سوال میں اللہ کے نبی ﷺ اس کو کیوں پیش کرتے؟ یہ طلب دلیلِ مطلوبیت ہے۔ لہٰذا اپنی جان سے زیادہ اللہ کی محبت اپنے دل میں سمانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

اس دعاء میں دوسری بات یہ فرمائی: "و أھلی" کہ آپ مجھے اپنی محبت میرے اہل وعیال سے بھی زیادہ دیجئے۔ جیسے جان سے محبت فطری ہے، ایسے ہی اہل وعیال کی محبت بھی فطری ہے، بچوں سے محبت ہوتی ہے، اسی طریقہ پر بیوی سے محبت ہوتی ہے، رشتہ داروں سے محبت ہوتی ہے، اہل خاندان سے محبت ہوتی ہے، ماں باپ سے محبت ہوتی ہے، ان سب لوگوں سے محبت ایک فطری چیز ہے، لیکن ان سب سے زیادہ اللہ کی محبت ہونی چاہئے، دوسروں سے بھی محبت تو ہو، لیکن غلبہ اللہ کی محبت کو ہونا چاہئے۔

اور تیسری بات فرمائی" ومن الماء البارد" کہ آپ کی محبت ٹھنڈے پانی کی محبت سے زیادہ دیدیجئے، ٹھنڈا پانی بھی اچھا لگتا ہے، ہر آدمی چاہتا ہے کہ ٹھنڈا پانی پئے، موسم سخت ہو گرمی کا ہو، لو چل رہی ہو، دوپہر کا وقت ہو، پسینہ نکل رہا ہو، حلق میں کانٹے پڑ رہے ہوں، ایسے وقت آدمی چاہتا ہے کہ ٹھنڈے سے ٹھنڈا پانی مل جائے۔ اور جب ٹھنڈا پانی پیتا ہے، تو انگ انگ سے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا ہوتا ہے، دل سے اللہ کا شکریہ ادا ہوتا ہے۔

اور رسول اللہ ﷺ کو بھی میٹھا اور ٹھنڈا پانی نہایت مرغوب و پسند تھا، اس لئے آپ کے لئے اس کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ (مشکوۃ:۱۲۳۳-۱۲۳۴)

یہ اس لیے کہ ٹھنڈا پانی پینے سے اللہ تعالیٰ کا شکر دل سے ادا ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ ٹھنڈا پانی بہت محبوب ہوتا ہے، تو اللہ کے نبی ﷺ کہتے ہیں کہ ٹھنڈے پانی سے

زیادہ اللہ تیری محبت مجھے چاہئے۔اس دعاء سے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ نبی اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی محبت مانگی ہے۔

اس بارے میں اور بھی دعائیں ہیں،ایک دعاء میں یہ الفاظ فرمائے:" اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ أَحَبَّ الْأَشْيَاءِ إِلَيَّ"(اے اللہ! اپنی محبت تمام چیزوں کی محبت سے زیادہ مجھ کوعطا فرما)(حلیۃ الاولیاء:۲۸۲/۸،الحزب الاعظم)

اس میں تمام چیزوں سے زیادہ اللہ کی محبت مانگی ہے،یہاں سب کی سب چیزوں کا ذکر کردیا،اس میں کچھ بھی نہیں چھوٹا،نہ بیوی،نہ بچے نہ کوئی اور چیز،سب چیزیں اس کے اندر آگئیں،تو معلوم ہوا کہ اس کی کوشش ہونی چاہئے کہ ہمارے دل میں اللہ کی محبت کو بسالیں اور ساری دنیا اور اس کی چیزوں سے اللہ کی محبت غالب ہو۔

جمالِ خداوندی:

اللہ تعالیٰ ہی سے سب سے زیادہ محبت کیوں ہو؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کی ذات میں اسبابِ محبت سب کے سب جمع ہیں اور سب سے زیادہ اس میں پائے جاتے ہیں،وہ اسباب کیا ہیں؟

عام طور پر محبت کا باعث وسبب حسن و جمال ہوا کرتا ہے،لوگ حسن کو دیکھ کر دیوانے ہوجاتے ہیں،جبکہ یہ دنیا کی مختلف چیزوں اور انسانوں کا حسن و جمال ذاتی و خانہ ساز نہیں ہے ،اور نہ تو پائیدار اور باقی رہنے والا ہے ،جب اس حسن فانی و ناپائیدار پر لوگ فدا ہوجاتے ہیں تو اب سوچئے کہ اللہ جل جلالہ کا جمال ذاتی بھی ہے اور باقی بھی،اعلیٰ بھی ہے اور اول بھی،تو کیا اس کے حسن پر فدا نہ ہونا چاہئے؟

بھائیو!اس لیے وہی اس قابل ہے کہ اس سے محبت کی جائے،اس پر اپنی جان

قربان کی جائے۔ مولانا حکیم اختر صاحب مدظلہ نے اسی کو اپنے اشعار میں فرمایا ؎

ہزاروں حسن کے پیکر لحد میں دفن ہوتے ہیں
مگر عشاق ناداں مبتلا ہیں خوش گمانی میں
نہ کھا دھوکہ کسی رنگینیٔ عالم سے اے اختر
محبت خالق عالم سے رکھ اس دار فانی میں

غرض یہ کہ دنیوی چیزوں کا حسن و جمال ختم ہو جانے والا ہے، ناپائیدار ہے، اور اللہ تعالیٰ کا جمال حقیقی بھی ہے، ذاتی بھی ہے اور باقی بھی، لہٰذا دل لگانے اور محبت کرنے کے قابل صرف اللہ کی ذات ہے۔

اللہ تعالیٰ کا جمال کیسا ہوگا؟ اس کا کون اندازہ کرسکتا ہے، پھر وہ جمال بھی بے کیف جمال ہے، جس کا ادراک یہاں ممکن نہیں، البتہ احادیث میں اس کا جو ذکر آیا ہے اس کو پڑھنے سے فی الجملہ اس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

جنت میں دیدار خداوندی:

چنانچہ امام ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث نقل کی ہے، اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب اہل جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے، تو ان کو ایک ہفتہ کی مقدار پر اللہ تعالیٰ کی زیارت کی اجازت ہوگی، اور وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی زیارت کریں گے، اللہ کا عرش ان پر ظاہر ہوگا اور جنت کے باغات میں سے ایک باغ ان کے لیے ظاہر کیا جائے گا، اور اس میں نور کے، لؤلؤ کے، یاقوت کے، زبرجد کے اور سونے اور چاندی کے ممبر رکھے جائیں گے، اور ان میں سے جو سب سے کمتر درجہ کا ہوگا وہ مشک و کافور کے ٹیلہ پر بٹھایا جائے گا۔

اس روایت کے آخر میں ہے کہ جب یہ جنتی مرد اس مجلس سے واپس ہوں گے اور اپنی جنتوں میں اپنی بیویوں سے ملیں گے تو وہ کہیں گی کہ مرحبا، مرحبا، تم پر آج ایک ایسا جمال ہے کہ جب تم یہاں سے گئے تھے تو وہ جمال نہیں تھا، یہ کیا بات ہے؟ مرد جواب دیں گے کہ آج ہم اپنے رب کی زیارت کر آئے ہیں، اس لیے ہم ایسے حسین وجمیل ہو گئے۔ (ترمذی: ۲/۸۱)

بعض احادیث میں آیا کہ جب اہل جنت جنت میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے پوچھیں گے کہ کیا تم مزید کچھ چاہتے ہو؟ وہ عرض کریں گے کہ اے اللہ! آپ نے ہمارے چہروں کو رونق بخشا، اور ہمیں جنت میں داخل کیا اور نجات عطا فرمائی، پھر اور کیا ہم چاہیں؟ اس پر اللہ تعالیٰ ان کی نظروں سے پردہ ہٹا دیں گے اور وہ اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے، اللہ کے نبی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جنتیوں کو اللہ کے دیدار سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہ ہوگی۔ (مسلم: ۲۹۷، ترمذی: ۲۵۵۲)

ان روایات سے کچھ کچھ اندازہ، اللہ کے جمال کا ہو سکتا ہے کہ وہ کیسا ہوگا کہ جنت کے جنتی، اس جمال کی زیارت سے مشرف ہوں گے تو ان چہروں پر بھی مزید جمال پیدا ہو جائے گا، اور یہ کہ جنت کی ساری محبوب و پسندیدہ چیزیں اپنی جگہ، مگر اللہ کے جمال کی زیارت کا لطف ولذت ہی کچھ اور ہوگا اور سب سے زیادہ محبوب یہی دیدار الٰہی ہوگا۔

کمال خداوندی:

دوسری وجہ کسی سے محبت کی یہ ہوتی ہے کہ اس میں کوئی کمال ہوتا ہے، جیسے اپنے شیخ واستاذ سے لوگ محبت کرتے ہیں کیونکہ ان میں علمی وعملی کمال پایا جاتا ہے۔ اسی

طرح دنیا کے علوم وفنون میں جو ماہر ہوتے ہیں ان سے محبت ان کے کمال ہی کی وجہ سے ہوتی ہے، مگر یہ ظاہر ہے کہ ان تمام کے کمالات فانی اور ناقص ہیں، اس کے باوجود ہمیں اپنے اساتذہ ومشائخ اور دیگر اہل علم وفن سے محبت ہوتی، تو کیا اللہ سے محبت نہ ہونا چاہئے جس کی ذات میں جو کمالات ہیں وہ ذاتی اور باقی ہیں، اور اعلیٰ و اکمل ہیں، وہ کون سا کمال ہے جو خدا تعالیٰ میں نہیں ہے؟ وہ تمام صفاتِ کمالیہ کا جامع ہے، چنانچہ علماء نے اللہ کی تعریف ہی یہ بیان فرمائی ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جو تمام صفاتِ کمالیہ کی جامع ہے''، اور اس کا ہر کمال، کمال کو پہنچا ہوا ہے، اس میں کوئی نقص نہیں، کوئی کمی نہیں، کوئی عیب نہیں۔

اس کے علم کو دیکھو، تو وہ غیب وشہادت سب کو برابر حاوی ہے، کوئی ذرہ بھی اس کے علم سے خارج نہیں، اس کی قدرت کو دیکھو کہ تمام ممکنات اس کے زیر تصرف، کوئی چیز اس کے احاطۂ قدرت سے باہر نہیں، ایسی قدرت کا مالک کہ جب کسی شی کو منصۂ شہود پر جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہے تو صرف ''کن'' کہنے سے وہ شی موجود ہو جاتی ہے، اس کی حکمت کو دیکھو کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس سے مستفید ہے، اس لیے ہر چیز کا ایک نظام ہے، ایک قاعدہ واصول ہے، ایک طریق عمل مقرر ہے، زمین وآسمان، شمس وقمر، انسان وحیوان، ہوا وپانی، آگ ومٹی، شجر وحجر، جن وملائک، وغیرہ وغیرہ لاتعداد مخلوقات اس کی قدرتِ قاہرہ اور حکمتِ بالغہ کی آیات ونشانیاں ہیں، کیا کوئی اور ہے جس میں ایسی قدرت ہو، ایسی حکمت ہو، اور ایسا علم اس میں پایا جاتا ہو؟ نہیں، ہرگز نہیں، تو پھر جب ہم معمولی علم وفن اور کمال کی وجہ سے دوسروں سے محبت کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ سے تو سب سے زیادہ محبت ہونی چاہئے؛ کیوں کہ اس کا کمال ذاتی وباقی ہے، اور اس کا کمال تمام مخلوقات کے کمالات کا منبع ومخزن ہے، اس

لیے وہی حقیقی معنی میں محبوب بننے کے قابل ہے۔

اللہ تعالیٰ کے بے مثال کمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت حکیم سنائی اپنے فارسی قصیدے میں کہتے ہیں ؎

نتواں وصف تو گفتن کہ تو در وصف نہ گنجی

نتواں شرحِ تو کردن کہ تو در شرح نیائی

یعنی تیری تعریف کرنا ممکن نہیں کیونکہ تو کسی کی تعریف کے پیمانے میں سما نہیں سکتا اور تیرے کمالات کی شرح بھی نہیں کی جاسکتی کیونکہ تیرے کمالات کسی کی شرح میں نہیں آسکتے۔

عطاونوال خداوندی:

یہ ہوئی دوسری وجہ جس کی بنا پر لوگ کسی سے محبت کرتے ہیں، اور یہ وجہ بھی اللہ میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔اب لیجئے تیسری وجہ کہ کسی سے محبت کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ عطاء وبخشش کا معاملہ کرتا ہے، جودوسخاوت سے پیش آتا ہے۔ چنانچہ غلام کو اپنے آقا سے محبت اسی عطا ونوال کی وجہ سے ہوتی ہے، اسی طرح ماں باپ اور محسنین سے محبت اسی وجہ سے ہوتی کہ وہ احسان کرتے ہیں، عطاء وبخشش کرتے ہیں، نوازتے ہیں۔

اب ذرا سوچئے کہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر رحم وکرم کرنے والا، عطاوبخشش کے دریا بہانے والا اور کون ہوسکتا ہے؟ مخلوق کے عطاونوال اور رحم وکرم کا حال تو یہ ہے کہ جب تک اس کی تابعدادی وفرمانبرداری کی جائے، اور اس کی ہمنوائی وہم آہنگی باقی ہو، تب تک یہ سلسلہ بھی جاری رہتا ہے اور جونہی اس کے خلاف کوئی بات صادر و ظاہر ہوتی ہے اس کی دادودہش کے دروازے بند ہوجاتے ہیں اور اپنے دروازوں

سے دھتکار دیتا ہے، مگر اللہ تعالی کی رحمت وکرم پر قربان جایئے کہ بندے ہزاروں نافرمانیاں اور سرکشیاں کرتے ہیں، پھر بھی وہ اپنی عطاء وبخشش کے دروازے بند نہیں کرتا، کفار ومشرکین اس کی گستاخیاں کرکے، مزے لیتے ہیں، اس کی تکذیب وتردید کرتے ہیں اور اس کے احکام وقوانین کا مذاق اڑاتے ہیں، مگر ان پر نہ کھانا بند کیا جاتا ہے نہ پانی، نہ ہوا روکی جاتی ہے، نہ روشنی۔ جب کفار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی دادودہش اور عطاونوال کا یہ حال ہے تو ماننے والوں پر کیا کچھ اس کی نوازشات وکرم فرمائیاں نہ ہوں گی۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے متعدد جگہ فرمایا ہے کہ اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو ممکن نہیں کہ تم شمار کرلو، ہر آن اس کی نعمتوں کی بارش ہم پر ہورہی ہے، بلکہ ہمارا وجود خود اس کی عظیم نعمت ہے، غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو اعضاء عطا فرمائے ہیں اور ان میں جو قوتیں ودیعت فرمائی ہیں، کیا کوئی اور یہ دے سکتا ہے؟ ایک گردہ فیل ہوجائے تو تمام ڈاکٹر اور دنیا کی تمام توانائیاں اور قوتیں مل کر بھی ایک گردہ انسان کو فراہم نہیں کرسکتے، اگر کوئی دے گا بھی تو وہ خود اللہ کا بنایا ہوا ہی ہوگا، یا انسان نقل اتارے گا تو وہ بھی اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں کے سہارے اور واسطے سے بنائے گا۔

ایک ایک عضو پر غور کیجئے کہ وہ کیسی قیمتی نعمتیں ہیں، اور بے بدل عطایا ہیں، پھر روزانہ کی ضروریات وحاجات کا کس طرح انتظام فرمایا ہے، اور کتنی اور کیسی نعمتیں عطا فرمائی ہیں؟ کیا اس لحاظ سے بھی کوئی اور اس کا ہمرتبہ وہم پلّہ ہوسکتا ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں تو پھر کیا وہی اس بات کا مستحق نہیں ہوگا کہ اسی سے محبت کی جائے اور وہی ہمارا حقیقی محبوب ہو؟

غرض یہ کہ ہر لحاظ سے اللہ تعالیٰ ہی کی ذات اس لائق ہے کہ اس سے محبت کی جائے، اور سب سے زیادہ محبت کی جائے۔

محبت الٰہیہ کا ثمرہ ایمانی حلاوت:

بزرگو اور دوستو! جب اللہ و رسول کی محبت دل میں جاگزیں ہوتی ہے اور دنیا کی تمام محبتوں پر وہ غالب ہوتی ہے تو اس کے صلہ و ثمرہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایمانی حلاوت نصیب ہوتی ہے۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول علیہ السلام نے فرمایا کہ:

''تین باتیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں وہ پائی جائیں وہ ایمان کی حلاوت (چاشنی) پائے گا: ایک یہ کہ اس کو تمام چیزوں سے زیادہ اللہ و رسول محبوب ہوں، دوسرے یہ کہ کسی بندے سے محبت صرف اللہ کے لیے کرے اور تیسرے یہ کہ کفر کی طرف لوٹنا اس کو اس قدر ناگوار ہو جیسے کہ آگ میں ڈالا جانا ناگوار ہوتا ہے۔
(مشکوۃ:۱۲)

حضرت نبی عربی محمد مدنی علیہ الصلوۃ والتسلیم کا ارشاد ہے کہ تین باتیں ایسی ہیں کہ جس کسی میں وہ پائی جائیں اس کو حلاوت ایمانی نصیب ہوگی، ان تین میں سے ایک بات یہ فرماتے ہیں کہ اللہ و رسول کی محبت تمام چیزوں کی محبت پر غالب ہو، جس کو یہ دولت حاصل ہو جائے اس کو ایمان کی حلاوت نصیب ہوگی یہ اللہ و رسول کی محبت کا صلہ و ثمرہ ہے۔ حلاوت مٹھاس کو کہتے ہیں اور عام علماء نے فرمایا کہ اس سے روحانی و معنوی مٹھاس مراد ہے۔

یہاں مجھے ایک بات اس کی تشریح میں یاد آ گئی کہ علامہ ابن حجرؒ عسقلانی جو بہت

بڑے محدث گزرے ہیں انہوں نے شیخ محی الدینؒ سے نقل کیا ہے کہ حلاوتِ ایمان سے مراد تین باتیں ہیں: ایک یہ کہ نیکی وعبادت سے لذت پائے، دوسرے یہ کہ دین کی خاطر مشقت وتکلیف کا برداشت کرے، اور تیسرے یہ کہ دین کو دنیوی ساز و سامان کے مقابلے میں ترجیح دے۔ (فتح الباری: ۱/۶۱)

شیخ محی الدینؒ نے حلاوت کی جو تفسیر وتشریح کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کو ظاہری مٹھاس پر نہیں، بلکہ معنوی وروحانی مٹھاس پر محمول فرمایا ہے چنانچہ مشاہدہ بھی ہے کہ اولیاء اللہ جو اللہ ورسول کی محبت میں سرشار ہوتے ہیں، وہ عبادت وطاعت میں ایک کیف وسرور پاتے ہیں اور دین کے لیے ہزار ہا قسم کے مصائب وشدائد برداشت کرتے ہیں اور اس میں بھی ان کو ایک لذت محسوس ہوتی ہے نیز وہ دنیوی ومادی ساز وسامان اور نفسانی خواہشات پر دین کو ترجیح دیتے اور دین کی خاطر ہر خواہش ولذت کو اور دنیوی آسائش وراحت کو قربان کر دیتے ہیں اور اس میں بھی ان کو حلاوت محسوس ہوتی ہے۔

طاعت کی لذت - ایک صحابی کا واقعہ

اللہ ورسول کی محبت جن لوگوں کو حاصل ہوتی ہے، ان کو نیکی وطاعت میں کیسا لطف وکیف محسوس ہوتا ہے اور وہ اس سے کیسے سرشار ہوتے ہیں، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجئے کہ ایک دفعہ غزوہ ذات الرقاع میں رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ نکلے، راستے میں ایک جگہ آپ نے پڑاؤ ڈالا اور حضرات صحابہ سے پوچھا کہ کون آدمی ہمیں پہرہ دے گا؟ اس کے جواب میں دو حضرات نے اپنا نام پیش کیا، ایک انصاری صحابی تھے جن کا نام عباد بن بشر تھا اور دوسرے مہاجر صحابی تھے جن کا نام عمار بن یاسر تھا، سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا کہ تم دونوں وادی کے اوپر والے حصے

پر رہنا، چنانچہ یہ دونوں صحابہ وہاں پہنچے، پھر مہاجر صحابی تو لیٹ گئے اور انصاری صحابی عباد نے اللہ تعالیٰ کے سامنے راز و نیاز شروع کر دیا اور نماز میں مشغول ہو گئے، غالباً ان حضرات نے یہ طے کر لیا ہوگا کہ آدھی رات ایک شخص پہرہ دے اور پھر آدھی رات دوسرا پہرہ داری کرے۔ جب حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ نماز میں اللہ تعالیٰ سے سرگوشی و مناجات میں مشغول ہو گئے تو ایک مشرک آدمی آیا اور چھپ کر ان پر تیر برسانے لگا، یہ صحابی برابر نماز میں مشغول رہے، اس مشرک نے تین تیر ان پر چلائے، ان صحابی نے تیر تو نکال کر پھینک دیا، مگر نماز نہیں توڑی، برابر نماز میں رہے اور رکوع وسجدہ کر کے جب نماز سے فارغ ہوئے تو ان صحابی کو بیدار کیا جو بازو لیٹے ہوئے تھے، انہوں نے اٹھ کر دیکھا تو یہ لہولہان ہیں، عرض کیا کہ سبحان اللہ! تم نے مجھے پہلے ہی کیوں نہ جگا دیا، فرمایا کہ میں ایک سورت پڑھ رہا تھا، میں نے نہیں چاہا کہ اس کو ادھورا چھوڑ دوں۔ بعض روایت میں ہے کہ ان صحابی نے فرمایا کہ خدا کی قسم اگر رسول اللہ ﷺ نے مجھے حفاظت و نگرانی کی ذمہ داری نہ دی ہوتی تو میں قتل ہو جاتا، مگر اس سورت شریفہ کو ادھورا نہ چھوڑتا۔ (ابو داود: ۱۹۸، مسند احمد: ۳۴۳/۳، صحیح ابن حبان: ۳۷۵/۳، صحیح ابن خزیمہ: ۲۴/۱، مستدرک: ۲۵۸/۱)

اللہ اکبر! کیا لذت ولطف تھا جو ان صحابی کو تلاوت کلام اللہ اور نماز میں محسوس ہو رہا تھا جس کی بنا پر وہ اپنے آپ کو ہلاک کر لینے پر بھی راضی ہیں، مگر تلاوت و نماز کو قطع کرنے پر راضی نہیں۔ یہ حلاوت ایمانی ہے جو اللہ و رسول کی محبت کا صلہ و ثمرہ ہے۔

حضرت عمارؓ اور شوقِ شہادت:

حضرت عمار بن یاسر مشہور صحابی ہیں، جنگِ صفین میں ان کی شہادت ہوئی۔ شہادت سے قبل نہایت بے چینی سے شہادت کا انتظار کر رہے تھے اور فرما رہے تھے

کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے بتایا تھا کہ میں اسی دن شہید ہوں گا، مگر کیا بات ہے کہ میں اب تک زندہ ہوں؟ نیز فرما رہے تھے کہ آج میں جبار یعنی اللہ تعالیٰ سے ملوں گا، اورحورعین سے شادی کروں گا اور میرے محبوب لوگوں حضرت محمد ﷺ اوران کی جماعت سے ملوں گا پھرلڑتے لڑتے شہید ہوگئے۔(حیاۃ الصحابہ:۱/۶۸۴)

غور کیجئے کہ حضرت عمار کوشہادت کی طلب اور جستجو اوراس کا انتظار اللہ ورسول کی محبت ہی کی وجہ سے ہوا اوراسی محبت خداوندی ومحبت رسول نے موت کوان کے لیے لذیذ ولطف آمیز چیز بنادیا تھا۔

غرض یہ کہ اس حدیث میں مراد لذت وحلاوت روحانی ہے جواللہ ورسول کی محبت غالبہ وشدیدہ کے صلہ میں ایک مومن کونصیب ہوتی ہے۔

حلاوتِ ایمانی کی دوسری تفسیر:

مگر بعض علماء نے فرمایا کہ روحانی ومعنوی لذت وحلاوت تو ملتی ہی ہے، اس کے ساتھ حسی حلاوت ومٹھاس بھی ملتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے کہ حلوہ وشکر ومٹھائی کھانے سے انسان کوحسی طور پراس کی حلاوت ومٹھاس معلوم ہوتی ہے۔

چنانچہ علامہ علی القاریؒ شرح مشکوۃ میں ایک دوسری حدیث پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ابن حجرؒ نے کہا کہ ایمان کی لذت ومزہ سے مراد حسی ومعنوی دونوں طرح کی لذت ومزہ ہے۔(مرقات:۱/۷۶)

معلوم ہوا کہ بعض حضرات اس جگہ مٹھاس ولذت سے حسی ومعنوی دونوں طرح کی حلاوت ولذت مراد لیتے ہیں۔ واقعی جوعشق محبت الٰہی سے چور ہوتا ہے اس کوکبھی حسی طور پربھی اللہ ورسول کے نام میں حلاوت معلوم ہوتی ہے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ ایسے ہی اولیاء اللہ میں سے تھے، چنانچہ خود ہی فرماتے ہیں۔

اللہ اللہ ایں چہ شیریں است نام
شیرو شکر می شود جانم تمام

(یعنی یہ فرماتے ہیں کہ یہ ''اللہ اللہ'' کس قدر میٹھا نام ہے کہ اس نام سے میری پوری جان ہی دودھ اور شکر ہو جاتی ہے)

یعنی میں دودھ اور شکر کی سی مٹھاس اپنے اندر پاتا ہوں۔ ایک اور مقام پر مولانا رومیؒ فرماتے ہیں۔

نامِ اُو چوں برزبانم می رود ہر بنِ موازعسل جوئے شود

(یعنی جب اللہ پاک کا نام میری زبان پر جاری ہوتا ہے تو میرے بال بال سے شہد کی نہریں جاری ہو جاتی ہیں)

یہ حلاوت وشیرینی جو اللہ پاک کے نام پاک سے محسوس ہو رہی ہے اللہ کی محبت کا نتیجہ ہے۔ غرض یہ کہ جب بندہ اللہ و رسول کی محبت میں سرشار ہوتا ہے تو اس کو حلاوت ایمانی کی عظیم دولت حاصل ہوتی ہے۔

ایک صحابی کی اللہ تعالیٰ سے محبت:

ایک صحابی کا واقعہ ہے کہ چند صحابہ کو ایک علاقہ میں جانا پڑا تو وہاں کے بادشاہ نے ان کو گرفتا کرنے کا حکم دیا، اس کے فوجیوں نے پکڑ کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا، بادشاہ عیسائی تھا، اس نے کہا کہ تم عیسائی بن جاؤ، انہوں نے کہا کہ ہم عیسائی نہیں بنتے، ہم تو مسلمان ہیں، ایک اللہ کو ماننے والے ہیں، ہم اسی ایک اللہ کا سبق ساری دنیا کو سکھانے کے لیے نکلے ہیں۔

اس نے کہا کہ یا تو تمہیں میری بات ماننی ہوگی یا نہیں تو میں تمہارے ساتھ سخت سلوک کروں گا۔ انہوں نے کہا کہ آپ کی مرضی جو چاہیں آپ کریں، لیکن ہم تو اپنے دین سے اور اپنے اللہ سے پھرنے والے نہیں۔

قرآن کریم میں ایک جگہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَه الخ﴾ (اے مسلمانو! تم میں سے کوئی اگر دین سے پھر جائے تو اللہ دوسری قوم کو پیدا کر دے گا، جو اللہ سے محبت رکھے گی، اللہ ان سے محبت رکھے گا)

معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کو ایسی قوم پسند ہے، ایسے مسلمان پسند ہیں جو اللہ کی محبت میں چور ہوں، سرشار ہوں، اس لیے اس کا ذکر کیا کہ تم پھرنا چاہو تو پھر جاؤ، ہمیں کوئی پرواہ نہیں، ہم دوسری قوم کو پیدا کریں گے جو ہم سے محبت کرنے والی ہوگی، اور پھر اس کے نتیجے میں ہم بھی اس سے محبت کریں گے۔

تو وہ صحابہ کرام کہنے لگے کہ تو جو چاہے کر، ہم تو پھرنے والے نہیں، تو اس نے اپنے خادموں کو حکم دیا کہ ایک کڑھائی میں تیل ڈالو اور نیچے سے آگ جلاؤ۔

چنانچہ بہت بڑی کڑھائی میں تیل ڈالا گیا، اور نیچے سے آگ جلائی گئی اور خوب زبردست طریقہ پر اس تیل کو پکایا گیا، جب وہ بالکل پک گیا اور کھولنے لگا تو اس نے ان دو حضرات میں سے پہلے ایک صحابی کو اٹھا کر اس میں ڈالنے کا حکم دیا۔ جب ان صحابی کو اٹھا کر اس میں ڈالا گیا تو وہ کباب کی طرح اس میں جل بھن گئے، کھولتا ہوا تیل تھا اور تپ رہا تھا اور پکا ہوا تھا، بس یوں ڈالا اور ان کی جان نکل گئی، ختم ہو گئے۔

اس کو دیکھ کر جو دوسرے صحابی تھے وہ رونے لگے، بادشاہ نے یہ سمجھا کہ شاید ان کا دل کچھ نرم ہوگیا ہے، اب یہ میری بات مان لیں گے، لہذا ان سے کہا کہ دیکھو تمہارا بھی یہی حشر ہوگا، اگر تم نے میری بات نہیں مانی، اس لیے میری بات مان لو اور رونے کے بجائے میری بات مان کر اپنی جان کی تم بچالو۔ وہ صحابی کہنے لگے کہ تجھے دھوکا ہورہا ہے، میں اس لیے نہیں رو رہا ہوں کہ میں ان کی جان کو یوں نکلتے ہوئے رہا ہوں، یہاں مجھے کوئی خوف اور کوئی دہشت اور کوئی وحشت نہیں ہورہی ہے، بلکہ میں تو اس لیے رو رہا ہوں کہ میں نے دیکھا کہ جوں ہی ان صحابی کو اس تیل میں ڈالا گیا ذرا سی دیر میں ان کی جان نکل گئی، تو میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے بھی تو اس میں ڈالے گا تو میری بھی اسی طرح جان نکل جائے گی، پھر میرے پاس اللہ کی محبت میں قربانی دینے کے لئے کوئی دوسری جان نہیں ہوگی، اس لیے میں رو رہا ہوں کہ ایک ہی جان ہے اور کہنے لگے کہ اگر میرے پاس سو جانیں ہوں تو میں یہ خواہش کروں گا کہ بار بار میری جان کو اس میں ڈالا جائے، اور میں سو مرتبہ اللہ کی محبت میں قربان ہوجاوں۔ (حیاۃ الصحابۃ: ۱/۲۴۷)

اللہ اکبر! کیا محبت تھی اللہ سے، کیسا عشق تھا صحابہ کا، کیا دنیا کا کوئی عاشق محبت کی ایسی مثال اور نظیر پیش کرسکتا ہے؟ حدیث میں بھی آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، میں یہ چاہتا ہوں کہ اللہ کے راستے میں مجھے قتل کیا جائے، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاوں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاوں، پھر زندہ کیا جاؤں''۔ (بخاری: ۲۶۴۴، معجم اوسط: ۸/۳۳۳، مصنف عند الرزاق: ۵/۲۵۴)

یہ اللہ کے راستے میں مرنا اللہ کی محبت میں مرنا ہے، جب یہ محبت غالب ہوتی

ہےتو اس کا یہ حال ہوتا ہے۔

بلکہ جو اس راہ میں آتا ہے اس کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے راستے میں مروں اور شہید ہو جاؤں، میں نے اپنی ایک نظم میں یہ شعر کہا ہے جو اسی حقیقت کی غمازی کرتا ہے:

عشق حق میں مرنا ہی قرب حق کا رستہ ہے
شوق گر ہو مرنے کا، رکھ قدم سفینے میں

جی ہاں! جس کو اللہ کے راستے میں مرنا ہے وہی اس راہ میں قدم رکھے گا، جس کو جینا ہو، عیش و راحت میں رہنا ہو اس کو اس راہ سے کوئی تعلق نہیں۔

حضرت ابراھیم علیہ السلام کی اللہ تعالی سے محبت:

میں نے حضرت مولانا ذوالفقار احمد صاحب دامت برکاتہم کی بعض کتابوں میں پڑھا ہے کہ حضرت ابراھیم خلیل اللہ علیہ السلام ایک مرتبہ بکریاں چرا رہے تھے، راستہ میں ایک آدمی اللہ تعالی کی محبت میں یہ تسبیح پڑھتا ہوا جا رہا تھا: "سبحن الملك القدوس سبحن ذی العزة والهيبة والكبرياء والجبروت" حضرت ابراھیمؑ کو یہ جملے بڑے اچھے لگے، اور ظاہر بات ہے کہ جس سے محبت ہوتی ہے، اس کے ذکر سے دل کو لذت ملتی ہے، اور دل اس کے لئے بے قرار ہو جاتا ہے۔

لہٰذا حضرت ابراھیمؑ نے اس آدمی سے درخواست کی کہ وہ اللہ کی تعریف کے یہ جملے ایک بار دہرائے تو اس نے کہا کہ میں دوبارہ پڑھوں گا تو آپ کیا دینگے؟ حضرت ابراھیمؑ نے فرمایا کہ آدھی بکریاں دیدوں گا، اس نے وہ تسبیح دوبارہ پڑھ دی اور آپ نے اپنی آدھی بکریاں اس کو دیدیں، مگر جب آپ نے ان جملوں کو سنا تو محبت خداوندی سے اور زیادہ بے قرار ہو گئے اور اس سے ایک بار پھر پڑھنے کی درخواست کی، تو اس

نے پوچھا کہ اب کے پڑھوں تو کیا دو گے؟ حضرت ابراھیمؑ نے فرمایا کہ بقیہ آدھی بکریاں بھی دیدوں گا، تو اس نے پھران جملوں کو پڑھدیا اور آپ نے باقی بکریاں بھی اس کو دیدیں، مگر ابراھیمؑ کی پیاس نہیں بجھی، آپ نے اس سے پھر پڑھنے کے لئے فرمایا، تو اس نے کہا کہ اب تو آپ کی ساری بکریاں ختم ہوگئی ہیں، اب پڑھوں گا تو کیا دو گے؟ حضرت ابراھیمؑ نے فرمایا کہ جی ہاں! بکریاں تو ختم ہوگئیں اور کوئی چیز میرے پاس دینے کو نہیں ہے، مگر خود میری ذات تو موجود ہے، اور آپ کو بھی کوئی بکری چرانے والا چاہیئے، اس لئے ایک بار اور پڑھ دیجئے اور اس کے بدلے میں میں آپ کا غلام بن جاوں گا، آپ مجھ سے ان بکریوں کو چرانے کا کام لے لیں۔

یہ سنکر اس آدمی نے کہا کہ دراصل میں اللہ کا فرشتہ ہوں، تمہارا امتحان لینے آیا تھا کہ آپ کو اللہ سے محبت کتنی ہے؟ یہ میں دیکھنا چاہتا تھا، آپ کامیاب ہوگئے، یہ لیجئے آپ کی بکریاں۔

اللہ اکبر! کیا عجیب محبت تھی! کیسا عشق تھا! کہ ایک بار اللہ کا نام لینے اور اس کی تسبیح بیان کرنے پر پہلے تو ساری بکریاں دیدیں، پھر خود اپنی ذات کو غلامی کے لئے پیش کردیا۔

محبت کا معاملہ غیرت سے متعلق ہے:

الغرض اللہ سے محبت ایک عظیم دولت ہے، اور اسلام میں اس کو مختلف پیرایوں میں واضح کیا گیا ہے، ہاں! مگر ایک بات یاد رکھئے کہ اللہ تعالی سے محبت رکھنا فرض ہے، اس کے باوجود اللہ تعالی نے محبت کرنے کا ہمیں کہیں حکم نہیں دیا ہے، قرآن میں آپ کہیں بھی نہیں دکھا سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہو کہ اے میرے بندو! مجھ

سے محبت کرو، جس طرح اللہ تعالی نے دوسری باتوں کا حکم قرآن پاک میں دیا اس طرح اللہ سے محبت کرنے کا حکم کہیں نہیں دیا ہے:

مثلاً قرآن میں تقوی کا حکم ہے: ﴿ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوااللّٰہَ﴾ (اے مومن بندو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو)۔

اسی طرح نماز کا حکم ہے: ﴿اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ﴾ (نماز قائم کرو)، کہیں زکاۃ کا حکم فرمایا: ﴿اٰتُوا الزَّکٰوۃَ﴾ (زکوۃ ادا کرو) وغیرہ۔

لیکن کہیں یہ نہیں فرمایا کہ اے میرے بندو! مجھ سے محبت کرو۔ وجہ یہ ہے کہ محبت کا معاملہ غیرت سے متعلق ہے، محبت کے ساتھ غیرت لازم ہے، اور جہاں یہ مسئلہ ہوتا ہے وہاں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تم میرے سے محبت کرو۔ دنیا میں کسی معشوق کو دیکھا آپ نے کہ وہ کہتا ہو کہ میں اس قابل ہوں کہ تم میرے سے محبت کرو، کوئی نہیں کہتا، جب دنیا کا ادنی معشوق بھی خود سے محبت کرنے کسی کو نہیں کہتا اور اس کو اس بات سے غیرت آتی ہے تو اللہ تعالیٰ تو سب سے بڑے غیور ہیں، وہ کیسے حکم دے سکتے ہیں ؟ اس لئے اللہ نے کہیں حکم نہیں دیا کہ تم مجھ سے محبت کرو، بلکہ جہاں بھی فرمایا وہاں ایک خبر کی حیثیت سے فرمایا، جیسے ایک جگہ ہے:

﴿ وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا أَشَدُّ حُبّاً لِّلّٰہِ﴾ (جو لوگ ایمان والے ہیں وہ اللہ تعالی سے شدید محبت کرتے ہیں)

لہٰذا تم بھی ایمان والے ہو تو مجھ سے محبت کرو، میں نہیں کہتا کہ تم میرے سے محبت کرو، بلکہ جو ایمان والے ہوتے ہیں وہ محبت کرتے ہیں، امر کا صیغہ نہیں فرمایا، بلکہ جملہ خبریہ سے خبر دی کہ جو ایسے ہوتے ہیں وہ ایسا کرتے ہیں، اب اگر تم بھی ایسے ہو تو تم بھی ایسا ہی کرو، اگر تم ایسے نہیں ہو تو ایسا نہ کرو، تمہاری مرضی کی بات

ہے،اس لیے فرمایا کہ جو ایمان والے ہوتے ہیں وہ اللہ تعالی سے محبت کرتے ہیں۔

محبت الٰہیہ کے آثار:

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ اللہ تعالی سے محبت کرنا اسلام میں مقصود ہے بلکہ مقصود اعظم ہے تو اب یہ بھی دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے آثاراوراس کے لوازمات کیا ہیں؟ اللہ کی محبت کی علامتیں کیا ہیں؟ تاکہ اس کی روشنی میں ہم یہ طے کریں کہ ہمارے دلوں میں اللہ کی محبت ہے یانہیں ہے؟

کیونکہ محبت کا دعوی تو سب کرتے ہیں مگر جب اس دعوے کی دلیل کا مطالبہ ہوتا ہے تو بہت کم لوگ اس میں کامیاب ہوتے ہیں،اور اکثر تو اس دعوے میں جھوٹے ہی نکلتے ہیں۔آج کے دور میں بالخصوص غلط قسم کے پیروں اور جھوٹے شیوخ کا ایک سلسلہ دیکھائی دیتا ہے، جو محبت الٰہیہ کا دم بھرتے ہیں،مگران کی حالت یہ ہے کہ اللہ کے احکام کو مسلسل توڑتے رہتے ہیں،اور گناہوں میں ملوث رہتے ہیں،اور عوام الناس کو دھوکہ دینے کے لئے یہ کہدیتے ہیں کہ ہم پہنچے ہوئے ہیں،اس لئے ہمارے سے احکام معاف ہوگئے۔لہذا یہ بات اچھی طرح یادرکھو کہ کوئی بھی شخص اللہ و رسول کی محبت کا دعوی کرے تو اس کو اس کے آثارولوازمات سے پہچاننا چاہئے۔

پہلی علامت اطاعت خداوندی:

اب سنو کہ محبت حق کے آثار کیا ہیں؟ سب سے بڑی اورسب سے بھاری علامت اللہ تعالیٰ کی محبت کی اطاعت ہے،اگرآدمی خدا کا مطیع نہیں ہے، فرمانبردارنہیں ہے،اللہ کے احکام پرنہیں چلتا ہے،من مانی زندگی گزارتا ہے تو اللہ تعالی کی محبت کبھی اس کے دل میں پیدانہیں ہوسکتی۔

اور یاد رکھئے کہ اللہ کی اطاعت اور اس کے احکام کی فرمانبرداری کے دو حصے ہیں: ایک حصہ اوامر پر چلنے کا اور دوسرا حصہ معاصی سے بچنے کا یعنی ایک تو وہ احکامات ہیں جن کا اللہ نے ہمیں آرڈر دیا ہے، جن کا حکم دیا کہ تمہیں یہ کام کرنا ہے، جیسے نماز پڑھنا ہے، روزہ رکھنا ہے، زکوۃ دینا ہے، حج کرنا ہے، فلاں کام کرنا ہے، یہ کہلاتے ہیں اوامر۔ ان سارے اوامر کو مان کر زندگی گزارنا ایک حصہ ہے اللہ کی اطاعت کا۔

اور دوسرا حصہ ہے اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ جتنے کام ہیں ان سب کاموں سے اپنے آپ کو بچائے، اس کو کہتے ہیں اجتناب عن المعاصی یعنی معصیتوں سے بچنا۔ یہ بھی اللہ کی اطاعت میں داخل ہے، اس لیے کہ اللہ کی اطاعت اگر ہم صرف یوں کرلیں کہ نماز کا وقت آیا تو نماز پڑھ لیا، لیکن جب گناہ سے بچنے کا وقت آیا تو بچنے کے لیے تیار نہیں تو اللہ کی پوری اطاعت نہیں ہوگی۔

بلکہ ایک بزرگ کی بات سناتا ہوں، انہوں نے فرمایا کہ گناہوں سے بچنا اصل طاعت ہے، اصل ولایت ہے، اس لیے کہ نیکی کرلینا تو نیک و بد سب کے یہاں مشترک ہے، فاسق وفاجر بھی کرلیتے ہیں، نیکی اچھے بھی کرلیتے ہیں اور برے بھی کرلیتے ہیں، نماز تو شرابی بھی پڑھ لیتا ہے، زناکار بھی پڑھ لیتا ہے، الٹا سیدھا کرنے والا بھی پڑھ لیتا ہے۔ تو یہ نیکی کا کرنا اچھائی وخوبی تو بہرحال ہے، لیکن معیارِ ولایت نہیں ہے، لیکن معیارِ ولایت کیا ہے؟ معیارِ ولایت ہے گناہوں سے بچنا، جس کا نام ہے تقویٰ۔ اسی لیے قرآن کریم نے فرمایا:

﴿ اِنْ اَوْلِیَاءُہٗ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ ﴾ (بچنے والے ہی دراصل اللہ کے ولی ہیں)

لہٰذا جو اللہ کا ولی بننا چاہے، جو ولایت کا درجہ پانا چاہے، تو اس کے لیے ضروری

ہے کہ گناہوں سے بچے۔ ہاں اس کے ساتھ اطاعت بھی یعنی نیکی بھی کرنا ہے۔ اس طرح دونوں کا جوڑ ہے، آپس میں گہرا ربط ہے، ایک آدمی نماز تو پڑھ لیتا ہے روزہ تو رکھ لیتا ہے، زکوۃ تو دیدیتا ہے، اور نیکیاں کر لیتا ہے، لیکن جہاں گناہ سے بچنے کا نمبر آتا ہے نہیں بچتا تو یہ اللہ کا ولی قیامت تک نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ جو بھی اللہ کا ولی ہوگا وہ اطاعت بھی کرے گا اور گناہوں سے بھی بچے گا۔

اللہ کے ولی کو کیسے پہچانیں: ایک واقعہ:

کسی آدمی کے بارے میں آپ کو جانچ کرنا ہے کہ یہ اللہ کا ولی ہے یا نہیں؟ تو دیکھئے کہ اطاعت اس کے اندر ہے تو وہ اللہ کا ولی ہے، اگر اطاعت اس کے اندر نہیں ہے تو وہ اللہ کا ولی کبھی نہیں ہوسکتا۔ بہت سارے لوگ ہوتے ہیں، جن کو لوگ پیر سمجھ کر ان سے بیعت بھی ہوجاتے ہیں اور ان کے ایسا حلقہ بگوش ہوجاتے ہیں کہ اللہ کو بھی بھول جاتے ہیں، رسول کو بھی بھول جاتے ہیں، لہذا اس معیار کو سامنے رکھ کر ایسے لوگوں کو آپ جانچ سکتے ہیں کہ یہ اللہ کے ولی ہوسکتے ہیں یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ جب محبت خداوندی کی یہ پہلی علامت ہی ان میں نہیں ہے تو یہ اللہ کے ولی کیسے ہو سکتے ہیں؟

ہاں شیطان کے ولی و دوست ہو سکتے ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جیسے اولیاء اللہ کا ذکر کیا ہے اولیاء الشیطان کا بھی ذکر کیا ہے۔

معلوم ہوا کہ ولی دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک ولی اللہ ہوتے ہیں، ایک ولی الشیطان ہوتے ہیں، جو اللہ کا ولی ہوتا ہے وہ اطاعت گزار ہوتا ہے، اور جو اللہ کا ولی نہیں ہوتا وہ شیطان کا ولی ہے، وہ شیطان کو خوش کرنے کے لیے خدا کی نافرمانی کرتا رہتا ہے۔

ایک بزرگؒ کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ان کے شہر میں ایک بزرگ کے آنے کی خبر پھیلی، لوگ ان سے ملنے جا رہے تھے تو وہ بزرگ بھی اپنے شاگردوں کے ساتھ ان سے ملنے کے لئے نکلے، جب وہاں پہنچے تو وہ صاحب وضو کر رہے تھے، جانے والے بزرگ دور ہی سے کھڑے ہو کر ان کو دیکھ رہے تھے، جب وہ وضو سے فارغ ہو گئے تو یہ بغیر ملاقات ہی واپس جانے لگے، ملاقات نہیں کی، شاگردوں نے پوچھا حضرت! آپ ملاقات کرنے آئے تھے اور بغیر ملاقات کے جا رہے ہیں، کیا بات ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ میں ان کے وضو کے طریقہ کو دیکھ رہا تھا جو خلاف سنت تھا، جسے وضو کی سنتیں معلوم نہ ہوں وہ اللہ کا ولی کیسے ہو سکتا ہے؟

دیکھئے صرف خلاف سنت وضو کرنے کی وجہ سے اللہ والا ماننے تیار نہیں، اور ہم ہیں کہ گناہگاروں کو بھی پیر سمجھتے ہیں۔

سب سے بڑی کرامت، ایک واقعہ:

اسی لئے بزرگوں نے فرمایا کہ سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ احکام خداوندی اور سنت نبوی کا اہتمام کیا جائے، اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا جو میں نے مرشدی حضرت اقدس شاہ مسیح اللہ خان صاحبؒ سے بارہا سنا ہے کہ ایک شخص نے حضرت جنید بغدادیؒ کی شہرت سنی تو ان کی خدمت میں پہنچا اور ان کی خانقاہ میں دس سال رہا، ایک دن آ کر حضرت سے کہا کہ حضرت میں واپس جانا چاہتا ہوں، حضرت نے فرمایا کہ تم دس سال تک جو یہاں رہے، اس کا کیا مقصد تھا اور کیا وہ مقصد تم کو حاصل ہو گیا؟ اس نے کہا کہ میں اس لئے آیا تھا کہ میں نے لوگوں سے آپ کا ذکر سنا تھا کہ آپ ولی اللہ ہیں، تو میں نے یہ سوچا کہ آپ سے بڑی بڑی کرامتیں ہوتی ہوں گی،

لہٰذا آپ کی خدمت میں رہنے آیا تا کہ آپ کی کرامت دیکھوں، مگر اب اس لئے جارہا ہوں کہ میں نے آپ سے اس عرصہ میں ایک کرامت بھی نہیں دیکھی۔

یہ سن کر حضرت جنید بغدادیؒ کو جوش آ گیا اور فرمایا کہ اچھا بتاؤ، تم نے دس سال کے عرصہ میں مجھے کبھی خلاف سنت کوئی کام کرتے دیکھا ہے؟ اس نے اب غور کیا اور کچھ دیر کے بعد کہا کہ نہیں، آپ سے کبھی بھی خلاف سنت کوئی کام ہوتے نہیں دیکھا۔ حضرت نے فرمایا کہ جنید کی اس سے بڑی کرامت کیا دیکھنا چاہتے ہو کہ اس نے دس سال میں ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے خدا کو ناراض نہیں کیا، کیوں کہ کوئی کام خلاف سنت نہیں کیا۔

اللہ اکبر! دیکھئے اللہ والے ایسے ہوتے ہیں، جن سے گناہ تو درکنار سنت بھی کبھی ترک نہیں ہوتی، اور یہی اصل کرامت ہے۔

محبت ومخالفت جمع نہیں ہوسکتے:

لہٰذا ولی اللہ وہی ہے جو اللہ کی اور رسول اللہ کی اطاعت کرتا ہو، اور اگر اطاعت نہیں کرتا تو یہ جھوٹا ہے، جیسا کہ حضرت رابعہ بصریہؒ نے فرمایا ہے ؎

تَعْصِی الْإِلٰـهَ وَأَنْتَ تُظْهِرُ حُبَّهٗ هٰذا لَعُمْرِیْ فِی الْقِیَاسِ بَدِیْعٗ
لَوْ كَانَ حُبُّكَ صَادِقاً لَأَطَعْتَهٗ إِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ يُحِبُّ مُطِيْعٗ

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ تو اللہ کی نافرمانی کرتا ہے اور اللہ کی محبت کا دعویٰ بھی کرتا ہے یہ بات نہایت عجیب ہے۔ اگر تیری محبت سچی ہوتی تو تو اس کی اطاعت کرتا کیونکہ چاہنے عاشق اپنے محبوب کا مطیع وفرماں بردار ہوتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ جسے کسی سے محبت ہوتی ہے وہ اسکی مخالفت نہیں کرتا کیوں کہ

محبت کے ساتھ معصیت ومخالفت جمع نہیں ہوسکتی، بلکہ اطاعت شعاری وفرمانبرداری ، محبت کے لوازمات میں سے ہے۔اسی لیے قرآن کریم نے فرمایا کہ:

﴿ قُلۡ إِن كُنتُمۡ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحۡبِبۡكُمُ اللّٰهُ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوبَكُمۡ وَاللّٰهُ غَفُورٞ رَّحِيمٞ ﴾[آل عمران:۳۱]

(آپ (اے نبی) کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہوتو میری اتباع کرو، پس اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرمائیں گے)

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے اس کی اطاعت وفرمانبرداری ضروری ہے، مگر چوں کہ رسول کی اتباع میں اللہ کی اطاعت مضمر ہے، اس لیے فرمایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرو۔اسی وجہ سے بعض حضرات سلف نے محبت کی تعریف ہی اطاعت سے فرمائی ہے۔

چنانچہ امام زہریؒ نے فرمایا کہ اللہ سے اور رسول سے محبت یہ ہے کہ اللہ ورسول کی اطاعت اور ان کے احکام کی اتباع کی جائے۔(تفسیر قرطبی:۶۰/۴)

اور ابن حجرؒ نے شیخ محی الدینؒ سے نقل کیا کہ اللہ سے محبت، اس کی اطاعت اور ترک مخالفت سے حاصل ہوتی ہے۔(فتح الباری:۶۱/۱)

غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ سے اگر بندہ کو محبت ہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ اس کی مخالفت اور معصیت نہ کرے، یہ اصل عظیم ہے، اس کو یاد رکھنا چاہئے۔

ایک صحابی میں جذبۂ اطاعت:

امام ابوداوٗدؒ نے ایک انصاری صحابیؓ کا عجیب واقعہ بیان کیا ہے جو انکے عشق رسول پر دلیل ہونے کے ساتھ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اصل محبت وعشق وہی

ہے، جس میں اطاعت وفرمانبرداری ہو اور مخالفت ونافرمانی نہ ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت رسول کریم ﷺ باہر تشریف لے گئے تو راستے میں ایک بلند قبہ بنا ہوا دیکھا اور صحابہ کرام سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ صحابہ کرام نے بتایا کہ یہ قبہ فلاں انصاری شخص کا ہے، حضور یہ سن کر خاموش ہوگئے، پھر وہ انصاری صحابی جن کا وہ مکان تھا، خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور سلام عرض کیا تو آپ نے منہ پھیر لیا اور کئی دفعہ ایسا ہی کیا، اس سے ان صحابی کو آپ کا ناراض ہونا معلوم ہوا، تو صحابہ کرام سے معاملہ پوچھا، صحابہ نے فرمایا کہ حضور نے تمہارا قبہ دیکھا تھا، یہ سن کر صحابی نے سمجھا کہ شاید آپ اسی قبہ کے بنانے سے ناراض ہیں اور واپس گئے اور اپنا مکان منہدم کر دیا اور زمین کے برابر کر دیا، پھر کسی وقت اللہ کے نبی اس طرف سے گزرے اور اس قبہ کو نہ پا کر سوال کیا کہ قبہ کیا ہوا؟ تب صحابہ نے پورا واقعہ آپ کو سنایا۔ (ابوداؤد:۲/۷۱۱، حدیث: ۵۲۳۷)

یہ ہے سچی محبت اور سچا عشق کہ محبوب کی اتباع واطاعت کرنے کی دھن اور فکر لگی رہے اور اس کو ناراض کرنے والی ادنی سی حرکت بھی گوارا نہ کرے، اور جیسے اللہ کے رسول ﷺ کی محبت کے لیے آپ کی اطاعت لازم ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے بھی لازم ہے۔

❁ اطاعت کے دو درجے:

فرمایا کہ اطاعت کے دو درجے ہیں: ایک ہے فرض درجہ اور ایک ہے نفل، فرائض کا درجہ نوافل سے بڑھا ہوا ہے، جب آدمی اللہ کی محبت حاصل کرنا چاہے، قربت حاصل کرنا چاہے تو اللہ کی محبت وقربت کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ فرائض

کو پوری پابندی کے ساتھ ادا کرے، فرائض کیا ہیں؟ یہ دو کام ہیں ایک تو یہ کہ جتنے کام اللہ نے ضروری قرار دیے ہیں ان سب کو ادا کرے، دوسرے یہ کہ جتنے کاموں سے بچنے کو ضروری قرار دیا ہے ان سے بچے، جب اس طرح تمام فرائض پر پوری طرح پابندی کرے گا تو ایک درجہ اس کا پار ہو جائے گا، اس کے بعد دوسرا درجہ نوافل کا ہے، جس سے بندہ اللہ کے قریب سے قریب تر ہوتا رہتا ہے۔

حدیث قدسی میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالی نے کہا کہ:

" مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیّاً فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ وَمَا تَقَرَّبَ إِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ أَحَبَّ إِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ ، وَمَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ إِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی أُحِبُّهٗ " ۔(بخاری:۶۱۳۷)

(اللہ فرماتے ہیں کہ جو شخص میرے دوست سے عداوت رکھے، میں اس سے اعلان جنگ کرتا ہوں اور بندہ کسی چیز سے جو مجھے پسند ہے میرے اتنا قریب نہیں ہوتا جتنا کہ فرائض سے جو میں نے اس پر فرض کئے ہیں، اور بندہ نوافل کے ذریعہ برابر میرے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس کو چاہنے لگتا ہوں)

پہلے فرائض ادا کرو اور قضاء کا طریقہ:

اگر آدمی فرائض ہی انجام نہیں دیا تو آگے کا وہ کوئی درجہ پار نہیں کرسکتا، بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا پہلا درجہ ہی پورا نہیں ہوتا، اگلے کی فکر میں لگ جاتے ہیں، نمازیں ہی پوری نہیں ہوئیں، سر پر نمازوں کا بار ہے، اللہ کا قرض ذمہ میں موجود ہے، لیکن باتیں بہت بڑی بڑی کرتا ہے، اگر آدمی کو اگلے مراحل طے کرنا ہے تو سب سے پہلے چاہئے کہ نمازیں اپنی پوری کرے۔

اس لیے میں نے پہلے بھی بتایا کہ جن کے ذمہ نمازیں باقی ہوں وہ تھوڑی تھوڑی کر کے اپنے ذمہ سے اس کو ادا کرتے رہیں، کم از کم ایک ادا نماز کے ساتھ ایک قضا نماز مزید پڑھ لے، کسی کی دس سال کی نمازیں باقی ہیں، کسی کی پانچ سال کی نمازیں باقی ہیں، کسی کی دو چار سال کی نماز باقی ہے، اس کو چاہئے کہ حساب لگائے، حساب لگانے کے بعد اس کو روزانہ ادا کرنا شروع کر دے، اسی طرح کسے کے ذمہ روزے باقی ہیں تو روزوں کی قضاء رکھے، بہت سارے لوگ ہیں جو زکوۃ ہی ادا نہیں کرتے، کئی سالوں کی ان کے ذمہ زکاۃ باقی ہے، ان کو چاہئے کہ حساب لگا کر زکوۃ ادا کریں۔

اس طرح جب فرائض کی ادائیگی ذمہ سے اتر جائے گی تو فرض کا درجہ مکمل ہوگا، اس کے بعد نوافل سے قرب حق کا دوسرا درجہ وہ پا سکتے ہیں۔ بعض لوگ فرائض کے بغیر ہی نوافل کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ مسئلہ سن لیجئے کہ فرائض کے باقی ہوتے ہوئے نوافل پڑھنا جائز نہیں ہے۔ فرائض کے پورا ہونے کے بعد نوافل کا نمبر ہے، جس سے درجات بلند ہوتے ہیں، جیسا کہ ابھی آپ نے حدیث سنی کہ آدمی نوافل سے برابر اللہ تعالی کے قریب ہوتا رہتا ہے۔

دوسری علامت - رضاء بالقضاء:

محبت کی دوسری علامت یہ ہے کہ راحت ونعمت یا آفت ومصیبت جو کچھ بھی اللہ کی طرف سے پیش آئے، اس پر بدل وجان راضی رہے، یہ نہیں کہ راحت ونعمت ملنے پر تو خوش ہو جائے اور آفت ومصیبت اور تنگی و پریشانی پیش آئے تو واویلا مچائے اور اللہ کا شکوہ کرنے لگے، یہ بات محبت سے بہت دور ہے۔ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ محبوب کی طرف سے جو بھی پیش آئے اس پر راضی رہے۔

حضرت محبوب سبحانی شیخ جیلانی علیہ الرحمہ نے ایک وعظ میں فرمایا ہے کہ اے کذاب! تو نعمت کی حالت میں خدا کو محبوب سمجھتا ہے، لیکن جب بلا آتی ہے تو بھاگ کھڑا ہوتا ہے، گویا اللہ عزوجل تیرا محبوب نہیں تھا، بندہ تو آزمائش ہی کے وقت ظاہر ہوتا ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلائیں آئیں اور تو جما رہے تو بے شک تو محبّ (عاشق خدا) ہے اور اگر تیری حالت میں تبدیلی آجائے تو جھوٹ کھل گیا اور پہلا دعویٔ محبت ٹوٹ گیا۔ (خطبات غوثیہ مجلس نمبر:۱)

ایک اور بزرگ حضرت یحییٰ بن معاذ رازیؒ نے بڑی عجیب بات فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ "حقيقة المحبة أن لا تزيد بالعطاء ولا تنقص بالجفاء" کہ محبت کی حقیقت یہ ہے کہ نہ عطاء سے بڑھے اور نہ جفا سے گھٹے۔ (مرقات:۱/۵۷، فتح الباری ایضا:۱/۶۲)

مطلب یہ ہے کہ حقیقی محبت ایسی ہوتی ہے کہ محبوب کی طرف سے عطاء ونوال اور بخشش ونوازش کا معاملہ ہو تو کیا اور اس کی طرف سے کچھ (ظاہری طور پر) پریشانی ومصیبت پیش آئے تو کیا، وہ ہر صورت میں برقرار رہتی ہے۔

محبت کو پرکھنے کا معیار:

اور یہی اصلی محبت کو پرکھنے کا معیار ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے نبی اللہ! میں آپ سے محبت رکھتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ دیکھ لو کیا کہتے ہو؟ انہوں نے پھر عرض کیا کہ میں آپ سے محبت رکھتا ہوں، اسی طرح تین مرتبہ انہوں نے کہا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم سچے ہو تو فقر وفاقہ برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ، کیونکہ فقر وفاقہ میرے چاہنے والوں کی طرف اس سے زیادہ جلدی آتا ہے، جتنا کہ سیلاب اپنی

منزل کی طرف چلتا ہے۔(ترمذی:۲۳۵۰،مستدرک:۴/۳۶۷،شعب الایمان: ۲/۱۷۳)

ایک اور موقعہ پر فرمایا کہ سب سے زیادہ سخت آزمائش انبیاء کرام کی ہوتی ہے، پھر ان کی جو ان سے زیادہ قریب ہوتے ہیں، پھر وہ جو ان کے بعد کا درجہ رکھتے ہیں۔ (ترمذی:۲۳۹۸،سنن دارمی:۲/۴۱۲،صحیح ابن حبان:۷/۱۶۰،وغیرہ)

غرض یہ کہ اللہ ورسول سے محبت کا دعویٰ تو سبھی کرتے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ آزمائش کے موقعہ پر وہ کس قدر ثابت قدم رہتا ہے، اور اس کو کس طرح خوشدلی سے برداشت کرتا ہے، اگر صبر وتحمل سے کام لیتا ہے اور شکوہ شکایت سے باز رہتا ہے اور اللہ کے فیصلہ پر راضی رہتا ہے تو وہ واقعی اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والا ہے، ورنہ وہ اپنے محبت کے دعوے میں جھوٹا ہے۔

مجھے حضرت شیخ جیلانیؒ کی بات یاد آتی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''اللہ ورسول کی محبت فقر وبلا کے ساتھ ملی ہوئی ہے، اسی لیے ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ بلا ومصیبت ولایت پر تعینات کردی گئی ہے تاکہ ہرکوئی ولایت کا دعوی نہ کرسکے، اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر شخص اللہ کی محبت کا دعویٰ کر بیٹھتا۔پس بلا وفقر پر جمے رہنے کو اللہ ورسول کی محبت کے لیے علامت بنا دیا گیا ہے۔(خطباب غوثیہ مجلس نمبر:۱)

غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ پیش آئے خواہ جی چاہے یا نہ چاہے اس پر راضی وصابر رہے۔

رضاء بالقضاء کی لذت:

یہ رضاء بالقضاء ایمان کا ایک حصہ ہے، اور اسی کے ساتھ اس میں دنیا میں بھی

ایک قسم کی حلاوت ولذت ملتی ہے ۔مولانا محمد علی جوہر نے ایک شعر کہا ہے جو بڑا جاندار وشاندار ہے،اس میں اس حقیقت کو سمجھا دیا ہے، کہتے ہیں:

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ
دنیا ہی بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ

واقعی جو شخص اللہ کی تقدیر پر راضی ہو جاتا ہے اور ہر خیر وشر کو اللہ کی طرف سے جانتا ہے اور اس میں اللہ کی حکمتوں کا مشاہدہ کرتا ہے وہ بڑے مزے میں ہوتا ہے، گویا اسے اس دنیا ہی میں جنت کا لطف ومزہ مل جاتا ہے۔

اور جب اس کو اس میں مزہ آتا ہے تو وہ بزبان حال یوں کہتا ہے:

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

کہ اے اللہ! کسی دشمن کو یہ بات نصیب نہ ہو کہ وہ آپ کے تیغ وخنجر سے ہلاک ہو، کیونکہ ہم دوستوں کا سر سلامت ہے کہ آپ اس پر خنجر آزمائیں۔

الحاصل جو اللہ کا بندہ اللہ کی جانب سے پیش آنے والے حالات کو اللہ کی جانب سے سمجھتا ہے اس کو اس میں مزہ آتا ہے،اور اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ یہ حالات ومصائب کسی کافر کو نہیں بلکہ ہمیں ہی پیش آئیں کہ یہ ہمارے محبوب کی طرف سے ہیں۔

آج کا دعویٔ محبت:

اس تفصیل کے بعد ذرا اپنے اوپر بھی ایک نظر ڈالتے چلئے،آج بہت سے لوگ دعویٔ محبت تو کرتے ہیں،مگر محبت کی جو شرائط بیان کی گئی ہیں،ان میں سے بعض کے پاس تو ایک بھی نہیں ہوتی اور بعض کے پاس ایک ہوتی ہے تو دوسری غائب ہوتی

ہے۔ مثلاً اطاعت خداوندی واطاعت رسول ہے جو محبت الٰہی کی اولین شرط ہے۔ اسی طرح ان کی معصیت ونافرمانی سے بچنا کہ محبت الٰہی کے لیے یہ بھی لازم ہے؛ مگر بہت سے دعویداران شرائط سے غافل ہی نہیں، بلکہ ان کے تارک بھی ہوتے ہیں کہ مستقل طور پر اللہ ورسول کی طاعت سے اعراض وروگردانی کرتے اوران کی نافرمانی اورمعصیت میں مبتلا رہتے ہیں اورساتھ ساتھ محبت وعشق خداوندی کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ عبادات میں غفلت وکوتاہی کی جاتی ہے ،معاشرتی احکام کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ اخلاقی قوانین سے بے التفاتی برتی جاتی ہے جب کہ یہ ساری تعلیمات وتلقینات حضرت محمد عربی ﷺ کے ذریعہ نازل فرمائی گئیں اورہم سے مطالبہ کیا گیا کہ ان کی پیروی کرو، مگر پیروی کے بجائے بے راہ روی اختیار کی جاتی ہے۔ کیا یہ محبت کا تقاضا ہوسکتا ہے؟

اسی طرح اگر اللہ کی طرف سے کوئی بیماری، پریشانی، آفت ومصیبت پیش آتی ہے تو واویلا مچایا جاتا ہے، اس کا شکوہ کیا جاتا ہے۔ بعض لوگ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کو گالیاں بھی دیتے ہیں۔ کوئی مرجائے تو چیختے چلاتے ہیں، ماتم کرتے ہیں، بے صبری کا پوری طرح مظاہرہ کرتے ہیں۔ کیا یہ اللہ سے محبت ہے؟ نہیں یہ تو خلاف محبت ہے۔

حضرت فاطمہؓ کا صبر وصال نبوی ﷺ پر:

حضرت فاطمہؓ نبی الثقلین سرورکونین حضرت محمد ﷺ کی لختِ جگر ونورِنظر، جب اللہ کے نبی ﷺ کا وصال مبارک ہوا تو ظاہر ہے کہ آپ کو بہت غم ہوگا، کس قدر غم ہوا ہوگا اس کا اندازہ ان کے ان اشعار سے لگایا جاسکتا ہے جو انہوں نے اس موقعہ

پر فرمائے تھے۔

صُبَّتْ عَلَيَّ مَصَائِبُ لَوْ أَنَّهَا صُبَّتْ عَلَى الْأَيَّامِ صِرْنَ لَيَالِيَا

(فرماتی ہیں کہ مجھ پر اللہ کے رسول کی وفات کی وجہ سے جو مصائب ڈالے گئے ہیں وہ اگر دنوں پر ڈال دیے جائیں تو دن رات ہو جائیں)۔

یعنی دن کی روشنی ان مصائب کا تحمل نہ کر سکے گی اور دن بھی اندھیریوں میں تبدیل ہو جائیں جیسے راتیں ہوتی ہیں۔

اندازہ کیجئے کہ کس قدر غم ہوگا، مگر کوئی شکوہ وشکایت انکی زبان پر نہ جاری ہوا۔ آج عورتیں اپنے کسی رشتہ دار باپ، ماں یا شوہر کے یا کسی اور کے انتقال پر نہایت ہی بے صبری کا مظاہرہ کرتی اور شکوہ وشکایت کی زبان دراز کرتی نظر آتی ہیں۔ یاد رکھو! یہ محبت الہیہ کے خلاف ہے۔

محبت حق پیدا کرنے کا طریقہ- ذکر حق:

اب سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ہوگا کہ ہمارے دل کے اندر اللہ کی محبت سمائے؟ اس کا کیا طریقہ ہے کہ ہم بھی اللہ کی محبت میں چور ہو جائیں؟ علماء وصوفیاء نے اس کے لیے چند اصول وطریقے بیان کئے ہیں۔

اس میں سب سے اعلیٰ اور سب سے اہم ترین طریقہ یہ ہے کہ اللہ کا ذکر کیا جائے جس قدر اللہ کا ذکر ہوگا، اللہ کی محبت دل میں سمائے گی، گھس جائے گی، رچ جائے گی، بس جائے گی۔

چنانچہ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: "يقول الله أنا عند ظن عبدى بى وأنا معه إذا ذكرنى فى ملإ ذكرته فى ملإٍ خير منهم ، وإن تقرب إلى شبرًا تقربت إليه ذراعاً ، وإن تقرب إلى ذراعاً تقربت

إليه باعاً، وإن أتاني يمشى أتيته هرولةً۔ (مسلم:۲۶۷۵)

(اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں میرے بندے کے گمان کے قریب ہوں اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں، جب وہ مجھے کسی مجمع میں یاد کرتا ہے تو میں اس سے بہتر مجمع میں اس کو یاد کرتا ہوں اور اگر وہ ایک بالشت میرے قریب ہوتا ہے تو میں ایک ہاتھ اس کے قریب ہوجاتا ہوں اور اگر وہ ایک ہاتھ میرے قریب ہوتا ہے تو میں دو ہاتھ اس کے قریب ہوتا ہوں اور اگر وہ میرے پاس چل کر آتا ہے تو میں دوڑ کر اس کے پاس جاتا ہوں)

بھائیو! اس حدیث سے کیا معلوم ہوتا ہے؟ یہ کہ جب بندہ اللہ کا ذکر کرتا ہے تو وہ اللہ کی قربت اور اللہ کی محبت پاتا ہے اور جب بندہ کو اللہ کی محبت ملتی ہے تو اس کے دل میں بھی اللہ سے محبت پیدا ہوجاتی ہے، کیونکہ جب اللہ ہم کو چاہے تو ضرور ہم بھی اللہ کو چاہیں گے۔

ذکر سے مذکور تک:

حضرت مولانا عبدالغنی پھول پوری علیہ الرحمہ حضرت حکیم الامت تھانوی کے ایک جلیل القدر و عظیم المرتبت خلیفہ گزرے ہیں، ان کی ایک بات یاد آئی، آپ فرماتے تھے کہ ذکر ذاکر کو مذکور تک پہنچا دیتا ہے۔

ذکر معلوم ہے اور ذاکر بھی معلوم ہے، مذکور کون ہے؟ مذکور اللہ کی ذات ہے، جب کوئی بندہ اللہ کا ذکر کرتا ہے تو یہ ذکر اس کو اللہ تک پہنچا دیتا ہے۔ کس قدر عظیم خوشخبری ہے ذاکرین کے لئے! کہ وہ اللہ تک رسائی پا جانے والے ہیں، اس سے بڑی کیا نعمت چاہئے؟

بعض سالکین کی ایک غلطی پر تنبیہ:

یہیں سے ان سالکین کی غلطی معلوم ہوگئی جو ذکر کی توفیق ملنے کے باوجود یہ کہتے پھرتے ہیں کہ ہم ذکر تو کر رہے ہیں مگر کوئی فائدہ محسوس نہیں ہو رہا ہے۔ اے سالکین! یہ بہت بڑی غلطی ہے، جب اللہ نے آپ کو ذکر کی توفیق عطاء فرمائی ہے تو یہ خود بہت بڑی اور عظیم الشان نعمت ہے، اگر اس کے بعد اور کچھ بھی نہ ملے تو بھی آپ کو بہت کچھ مل گیا۔ اس کے علاوہ قرآن و حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب بندہ اللہ کا ذکر کرتا ہے تو خود اللہ تعالی بھی بندہ کو یاد کرتے ہیں، جیسے ابھی میں نے حدیث سنائی تھی، اور قرآن میں بھی یہ بات ہے، چنانچہ فرمایا کہ " فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ " کہ تم مجھے یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا۔ اس سے بھی بڑی کیا چیز چاہئے کہ اللہ ہمیں یاد فرمائیں اگر کوئی ہمیں بتائے کہ وزیر اعظم یا چیف منسٹر نے ہمیں یاد کیا تو ہماری حالت کیا ہوتی ہے، کس قدر خوشی وفخر محسوس ہوتا ہے؟ جب کہ یہ سب ہم ہی جیسے بندے اور مخلوق ہیں، اگر ہمیں اللہ تعالی یاد کریں تو بتاؤ اس سے بڑی کیا نعمت ہوسکتی ہے؟

ایک صاحب حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے پاس آئے اور یہی شکایت کرنے لگے کہ میں ذکر تو کرتا ہوں، مگر مجھے کچھ حاصل نہیں ہو رہا ہے، حضرت حاجی صاحب نے جو کہ اس راہ کے رہبر ہیں انہوں نے فرمایا کہ تم اس سے بڑھ کر اور کیا چاہتے ہو کہ اللہ نے تم کو اپنے پاک نام کے لینے کی توفیق دیدی، یہ کیا کچھ کم ہے؟

کیا ہمارے پاس ذکر کرنے کے لئے وقت نہیں؟

بہت سارے لوگ ذکر شروع کرتے ہیں، لیکن پابندی نہیں کرتے، کوئی آٹھ

دن تک کیا، اس کے بعد چھوڑ دیا، کوئی دس دن کیا، اس کے بعد چھوڑ دیا، کوئی ایک مہینہ دو مہینہ کیا، اس کے بعد چھوڑ دیا، مصروفیات اور مختلف قسم کی مشغولیات کا بہانہ سامنے آتا رہتا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بہانہ اور عذر بالکل بے کار اور فضول ہے، کل بھی میں ایک صاحب سے کہہ رہا تھا کہ اپنے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے دو فہرستیں تیار کیجئے: ایک فہرست ان اعمال کی اور مصروفیات کی جو ہمارے لیے ضروری ہیں، دوسری فہرست ان اعمال کی اور مصروفیات کی جو غیر ضروری ہیں، صبح سے لے کر شام تک جو اعمال ہم سے صادر ہوتے ہیں، اس پر غور کریں کہ میں صبح اٹھا، اس کے بعد یہ کام کیا، اس کے بعد یہ کام کیا، شام تک کا حساب لگائے، ایک خانہ میں ان چیزوں کو لکھتا جائے جن کو ضروری سمجھتا ہے، اور دوسرے خانہ میں ان اعمال کو لکھتا جائے جو غیر ضروری ہیں۔ اب اس کے بعد یہ دیکھے کہ کونسی فہرست لمبی ہے، میرا اپنا خیال یہ ہے، اندازہ یہ ہے کہ ہماری وہ فہرست بڑی لمبی چوڑی نکلے گی جو غیر ضروری چیزوں پر مشتمل ہے، فضولیات پر مشتمل ہے، کیونکہ ہمارے پاس بے کار دھندے، اور خوامخواہ کی بات چیت اور فضول کاموں کا ایک طویل سلسلہ ہے، بلکہ گناہوں کا سلسلہ بھی ہے، کہیں غیبتیں ہیں، کہیں چغلیاں ہیں، کہیں بہتان تراشیاں ہیں، کہیں ادھر ادھر کی بکواس ہے، اس طرح کی بہت ساری چیزیں اس میں ملیں گی۔ اور جو انتہائی ضروری کام ہیں ان کی فہرست بہت مختصر ہوگی، کیونکہ ہم ضروری کام تو کرتے ہی نہیں، تو آپ کو خود ہی اندازہ ہوجائے گا کہ آپ کی مشغولیت کا جو آپ بہانہ بناتے ہیں یہ غلط ہے۔

جب آدمی کہتا ہے کہ اتنا مصروف ہوں، اتنا مصروف ہوں کہ ذکر نہیں کرسکتا،

بڑی شرم کی بات ہے، کیا ذکر اللہ سے بھی بڑھ کر کوئی ضروری کام ہے، کیا اللہ کے ذکر سے بھی بڑھ کر بھی مؤمن کی کوئی مشغولیت ہوسکتی ہے؟ دوکان سے بڑھ کر، مکان سے بڑھ کراور دنیاو مافیہا سے بڑھ کر کیا اللہ کی ذات نہیں ہے؟

جب ہم ان سب چیزوں کو وقت دینے کے لیے تیار ہیں، تو پھر اللہ کے ذکر کے لیے ہمارے پاس وقت کیوں نہیں؟ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہانہ بالکل فضول قسم کی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پاس بہت وقت ہے، اللہ تعالیٰ نے بے شمار وقت ہم کو دیا ہے۔

دنیا کے مشغلے ذکر میں رکاوٹ بنیں تو کیا کریں:

اور اگر مان بھی لیا جائے کہ وقت ہمارے پاس کم ہے اور ہم وقت نہیں نکال پارہے ہیں اور اس وقت میں کچھ بھی نہیں کر سکتے تو ایک بات عرض کرتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اگر ایسا ہی ہمارا خیال ہے، تو پھر ہم کو ساری دنیا کی مصروفیتوں کو چھوڑ کر صرف ذکر کو پکڑ لینا چاہئے، اس لیے کہ جب دنیا کے مشغلے اللہ کے ذکر میں رکاوٹ بن رہے ہیں، تو ان سب کو چھوڑ کر، بس ذکر ہی کرے آدمی۔ ایک شاعر نے کہا ؎

إذَا كُنتُ أَعلم عِلماً يَقِيناً   بأنَّ جميعَ حَياتِيُ كَسَاعَه
فلِمَ لا أكُونُ ضَنِيناً بِهَا   وَأَجعلُهَا فى صَلاح وَ طَاعَه

(یعنی شاعر کہتا ہے کہ جب میں یقینی طور پر اچھی طرح یہ جانتا ہوں کہ میری پوری زندگی ایک گھنٹے کے برابر ہے تو پھر میں کیوں نہ بخیل بن جاؤں اپنی اس زندگی کے بارے میں، اپنے وقت کے بارے میں کہ میں بخیلی کرتے ہوئے کنجوسی برتتے ہوئے اس پورے وقت کو نیکی وطاعت میں کیوں نہ لگادوں)

ارے جب وہ جانتا ہے کہ اور کچھ وقت نہیں مل رہا ہے تو اسے یہی چاہئے کہ اللہ

کے ذکر میں لگ جائے، اللہ کی طاعت میں لگ جائے، اور بس پوری زندگی اسی کے لیے وقف کردے اور حقیقت بھی یہی ہے۔

فضول گفتگو سے بچنے کی تدبیر، مولانا میاں صاحب کا واقعہ:

ایک بزرگ تھے دیوبند میں جن کا نام ہے حضرت مولانا میاں صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے محدث تھے، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے بھی اساتذہ میں سے ہیں، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ان کا واقعہ ذکر کیا ہے کہ ان کی مجلس ہوتی تھی اور اس میں علماء، صلحاء اور طلباء سب جمع ہوتے تھے اور کوئی مسئلہ پوچھتا، کوئی مشورہ لیتا، حضرت کبھی کچھ بیان فرماتے اور کبھی مسائل کی تحقیق ہوتی، مختلف قسم کی باتیں ہوتی رہتیں۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں کہ ایک دن حضرت نے فرمایا کہ بھائی کل سے ہماری مجلس میں گفتگو صرف عربی زبان میں ہوگی اردو میں نہیں، اس کے بعد مجلس برخاست ہوگئی اور لوگ چلے گئے، دوسرا دن ہوا تو لوگ آئے، آنے کے بعد سب خاموش بیٹھے ہوئے ہیں، کوئی بولتا نہیں، کوئی کچھ پوچھتا ہی نہیں، اگرچہ وہ علماء تھے، طلباء تھے، لیکن عام طور پر عربی زبان میں گفتگو کی مشق چونکہ نہیں ہوتی ہے تو وہ جیسے اردو سرسر بول لیتے ہیں، اس طرح نہیں بول پاتے، اور سب کے سب خاموش بیٹھے ہوئے ہیں، بہت دیر کے بعد کسی نے کہا کہ حضرت ایک مسئلہ ہے، عربی میں اس نے ایک جملہ بہت ہی جچا تلا استعمال کیا، اب حضرت نے اس کا جچا تلا عربی میں جواب دیا، پھر مجلس پر خاموشی طاری ہوگئی، پھر کچھ دیر کے بعد کسی نے سوال کیا، پھر اسی طرح جواب ہوگیا پھر خاموشی طاری ہوگئی، دو چار ہی باتیں ہوئیں تھیں کہ عصر سے مغرب تک کا وقت ختم ہوگیا اور لوگ چلے گئے۔

دوسرا دن ہوا وہی کیفیت ،تیسرا دن ہوا وہی کیفیت ،کوئی کچھ بولتا ہی نہیں، دو تین دن کے بعد کسی نے حضرت سے سوال کیا کہ حضرت! آپ نے یہ عربی والی قید لگا کر ہم لوگوں کو بڑی مشکل میں ڈال دیا اور استفادہ کا دروازہ بند کر دیا، افادہ کا دروازہ بند ہو گیا ہے، آپ نے ایسا کیوں کیا؟ تو حضرت نے فرمایا کہ بھائی میں دیکھ رہا تھا کہ لوگ ایک چھوٹی سی بات ہوتی ہے، لیکن اس چھوٹی سی بات کے لیے بہت سے فضول الفاظ استعمال کرتے ہیں، پانچ لفظوں میں جو بات پوری ہو سکتی ہے اس کے لیے دس لفظ استعمال کرتے ہیں، جو بات دس لفظوں میں پوری ہو سکتی ہے اس کے لیے چالیس پچاس لفظ استعمال کرتے ہیں، وہ سب فضول ہوتے ہیں، اس لئے میں نے سوچا کہ ہماری اتنی عمریں ہو چکی ہیں، میری عمر پچاس ہو گئی ہے، کسی کی عمر چالیس ہو گئی، کسی کی عمر پینتالیس ہو گئی، کسی کی عمر بیس ہو گئی ہے۔ اور لوگ لمبی لمبی گفتگو کر کے اپنا وقت برباد کرتے ہیں، میں نے سوچا کہ یہ فضول گوئی میں جو وقت گزر رہا ہے، اس سے ان لوگوں کو بچاؤں، اس لیے میں نے یہ قید لگا دی کہ عربی میں بولو، اب عربی میں بولے گا تو جچے تلے الفاظ میں بولے گا، بے کار کوئی لفظ استعمال نہیں کرے گا، جیسے اردو میں آدمی بکواس کر لیتا ہے، اس لیے وہاں بڑا سوچ سمجھ کر بولے گا، ضرورت ہی کا لفظ بولے گا، بلکہ جتنا ضروری ہے وہ بھی پورا نہیں بول سکے گا، اس میں بھی کچھ گھٹ ہی جائے گا۔ اس لئے میں نے یہ قید لگائی ہے۔

بھائیو! یہ تھی ہمارے بزرگوں کی نظر کہ ہمارا وقت خراب نہ ہو اور اس وقت کو بچا بچا کر رکھے، اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے سامان تیار کیا جائے، اللہ تعالیٰ کے عشق کو دل میں بسانے کے لیے تدبیریں کی جائیں، اور وہ سارا وقت اسی کے لیے صرف ہو جائے۔

عمر گھٹتی ہے یا بڑھتی ہے؟

اور لوگ کہتے ہیں کہ ہماری عمر بڑھ گئی، بڑھ کہاں گئی؟ درحقیقت گھٹ گئی، دراصل جتنی عمر لے کر آدمی آیا تھا اس سے گھٹ گئی، جب بچہ پیدا ہوا تو وہ مثال کے طور پر پچاس سال کی عمر لے کر آیا، یا کوئی ستر برس کی عمر لے کر آیا، اور ہر ایک سال گزرنے کے بعد اس کا برتھ ڈے منایا جاتا ہے، لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا بچہ ایک سال کا بڑا ہو گیا، حالاں کہ یہ بے وقوفی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس کا اس کی لائی ہوئی عمر میں سے ایک سال کا گھٹ گیا ہے۔

ایک عربی شاعر نے ایک عجیب شعر کہا ہے ۔

یَسُرُّ الْمَرْءَ مَاذَهَبَ اللَّيَالِي　　　وَ كَانَ ذَهَابُهُنَّ لَهٗ ذَهَاباً

کہتا ہے کہ آدمی کو یہ بات بہت خوش کرتی ہے کہ اتنی راتیں گزر گئیں اور اتنے دن گزر گئے، ایک سال گزر گیا، دو سال گزر گئے، تین سال میرے گزر گئے، میں اتنا بڑا ہو گیا، حالانکہ ان کا گزرنا تو خود اس کا گزر جانا ہے، یہ ایام اور راتیں گزرتی ہیں تو حقیقت میں یہ خود بھی گزرتا رہتا ہے۔

جب یہ راتیں اور دن گزرتے ہیں تو یہ کہتا ہے کہ میں اتنا بڑا ہو گیا، حالانکہ اور گھٹ گیا اور گھٹتے گھٹتے ایک دن تو وہ پوری طرح گھٹ ہی جائے گا، بلکہ مر ہی جائے گا، اور قبر میں دفن ہو جائے گا اور یہ سمجھ رہا ہے کہ میں بڑھ رہا ہوں، حالانکہ گھٹتا جا رہا ہے۔ احقر کا اس پر ایک شعری قطعہ سن لیجئے:

بجلی کی طرح تیز گزرتے دیکھا
اور مثلِ برف ہم نے پگھلتے دیکھا

کہتا ہے زمانہ عمر بڑھتی ہے شعیبؔ
ہم نے تو ہمیشہ اِسے گھٹتے دیکھا

تو میں کہہ رہا تھا کہ اللہ کا ذکر سب سے زیادہ اہم ترین چیز ہے۔لہٰذا اللہ کا ذکر شروع کیجئے، ذکر مقصود اعظم ہے۔

کیا آپ ﷺ ہمیشہ اللہ کا ذکر کرتے تھے،ایک علمی افادہ:

اللہ کے نبی ﷺ کے بارے میں حدیث میں آتا ہے" إن النبی ا کان یذکراللّٰهَ علی کُلِّ أحیانِه "(اللہ کے نبی ﷺ تمام اوقات میں اللہ کے ذاکر تھے) کوئی وقت ایسا نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کرتے ہوں۔(مسلم:۳۷۳)

علماء نے لکھا ہے کہ اس سے وہ وقت مستثنیٰ ہے جو استنجا کے لیے ہوتا ہے،اس لیے کہ استنجا خانہ میں جب جاتے ہیں تو وہاں پر ذکر اللہ منع ہے،لیکن باقی اوقات سب کے سب ذکر اللہ میں مشغول رہتے تھے۔

لیکن میرے ذہن میں اس سلسلہ میں ایک لطیف بات آتی ہے،وہ یہ کہ جو اللہ تعالیٰ کا ذکر بیت الخلاء کے موقعہ پر منع ہے،وہ اس لیے ہے کہ آدمی جب بیت الخلاء جاتا ہے تو اس سے گندگی خارج ہوتی ہے،اور وہ ناپاک ہو جاتا ہے،اور گندگی میں تلوث کی وجہ سے ہم اس قابل نہیں رہتے کہ اللہ تعالیٰ کا وہاں پر نام لیں،لیکن رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اکثر وبیشتر علماء کی رائے ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ کا فضلہ بھی پاک تھا،تو اللہ کے نبی ﷺ سے جو خارج ہوتا تھا وہ فضلہ پاک تھا تو آپ کو تلوث بالنجاست نہیں ہوتا تھا،اور جب تلوث بالنجاست نہیں تو آپ کے لیے بیت الخلاء میں اللہ کا ذکر ممنوع نہیں،ممنوع تو ان کے لیے ہے جو ملوث ہوتے ہیں نجاست کے

ساتھ، اور جن سے خروج ہوتا ہے نجاست کا، اور جب نجاست کا خروج ہی وہاں پر نہیں، تلوث بالنجاست نہیں تو آپ کے لیے ممنوع نہیں، اس لیے اگر اس حدیث " إن النبی ﷺ کان یذکراللّٰہ علی کل احیانہ "(اللہ کے نبی ﷺ تمام اوقات میں اللہ کے ذاکر تھے) کو اپنے پورے عموم پر رکھ لیا جائے تو کوئی اعتراض نہیں، استثناء کی کوئی ضرورت نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

بہر حال ایک رائے کی بات ہے، رائے تو بھائی کبھی رائی کے برابر ہوتی ہے، اور کبھی پائی کے برابر ہوتی ہے، اب یہ رائی کے برابر ہو تو ٹھکرا دیجئے نہیں تو قبول کر لیجئے، اگر صحیح ہو تو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ معاف فرمادے اور اس کے شر سے ہماری حفاظت فرمائے۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضرت سیدنا عمر بن الخطابؓ جب کوئی رائے پیش کرتے تھے تو اس وقت یہ فرماتے تھے کہ اگر یہ صواب ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے، اور اگر اس میں کوئی خطا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے درگزر فرمائے۔

تو بہر حال یہ تو ضمنی بات تھی، دراصل یہ کہنا تھا کہ نبی اکرم ﷺ ہر وقت ذکر اللہ میں رہتے تھے۔

ذکر کا دوسرا طریقہ:

ذکر اللہ کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آدمی بیٹھ کر اللہ کو یاد کرے، خاص وقت میں، اور دوسرا طریقہ اس کا یہ ہے کہ چلتے ہوئے پھرتے ہوئے مختلف اوقات میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرے، اور اس کی ایک تدبیر یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ان دعاؤں کے پڑھنے کا اہتمام کرے جو اللہ کے نبی ﷺ نے مختلف اوقات کی ہم کو تعلیم دی ہے، کھاتے

وقت کی دعاء ہے، پیتے وقت کی دعاء ہے، کھانا ختم کرتے وقت کی دعاء ہے، کھانے کے درمیان کی دعاء ہے، بیت الخلاء جانے کی دعاء ہے، بیت الخلاء سے آنے کی دعاء ہے، گھر سے باہر نکلنے کی دعاء ہے، گھر میں داخلے کی دعاء ہے، سونے کی دعاء ہے، اٹھنے کی دعاء ہے، اور بعض ایسی دعائیں جس میں ہم اپنے گناہوں سے استغفار کے ذریعہ اللہ کو یاد کر سکتے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ " یا أَیُّهَا الناسُ تُوبُوا إلی اللّٰهِ ، فَإِنِّی أَتُوبُ إِلَیْهِ کُلَّ یوم مِائة مرةً "(اے اللہ کے بندو! اللہ تعالیٰ کی جناب میں توبہ کرو، کیوں کہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی جناب میں ایک دن میں سو سو دفعہ توبہ کرتا ہوں)۔(مسلم:۲۷۰۲)

تو یہ توبہ بھی اللہ کا ذکر ہے، اور زندگی کے تمام اوقات میں دعائیں اللہ کے نبی ﷺ سے منقول ہیں، اگر ان اوقات کی دعاؤں کو یاد کیا جائے اور وقت وقت پر ان کو پڑھ لیا جائے تو ہمارا پورا وقت ذکر اللہ میں مشغول ہو جائے گا۔

کتنی آسان تدبیر ہے، بہترین تدبیر ہے، ان دعاؤں میں کہیں وہ ذکر، اللہ تعالیٰ کی یاد کے طور پر ہے، اور کہیں وہ ذکر، اللہ کے شکر کے طور پر ہے، اور کہیں وہ ذکر، طلب اور دعا کے عنوان سے ہے، لیکن کسی نہ کسی طور پر اللہ کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔

لہٰذا آدمی کو جو دنیوی کام کرنا ہے وہ بھی کرے اور اس کے ساتھ ذکر بھی کرے تو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی، اس لیے اللہ تعالیٰ کے ذکر میں اس طرح لگنا چاہئے۔

اور اس ذکر کا حاصل اور خلاصہ اور اس ذکر کا نتیجہ اور ثمرہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہو جاتی ہے، اس لیے کہ جو آدمی جس کا ذکر زیادہ کرتا ہے، اس سے محبت ہو جاتی ہے اور جس آدمی کو جس سے زیادہ محبت ہوتی ہے، وہ اس کا زیادہ ذکر بھی

کرتا ہے، یہ لازم ملزوم چیزیں ہیں، اگر محبت نہیں ہے ذکر شروع کر دو، محبت آ جائے گی اور اگر محبت پہلے سے موجود ہے تو پھر بھی آدمی اسی کا ذکر بار بار کرتا رہتا ہے، ذکر وہ چیز ہے۔

حصولِ محبت کا دوسرا طریقہ-نعمتوں میں غور وفکر:

بات شروع کی تھی اللہ تعالی کی محبت پیدا کرنے کے طریقے کے متعلق کہ وہ کس طرح پیدا کی جا سکتی ہے، تو میں نے ایک طریقہ یہ بیان کیا کہ اس کا طریقہ اللہ کا ذکر ہے۔اور اللہ کی محبت پیدا کرنے کا دوسرا طریقہ اللہ تعالی کی نعمتوں میں غور وفکر کرنا ہے، یہ ہم جانتے ہیں کہ اللہ کی بے شمار نعمتیں ہیں، ایسی ایسی نعمتیں ہیں جن کی کوئی انتہاء نہیں ہے، کوئی حد نہیں ہے، عجیب وغریب نعمتیں ہیں، ان نعمتوں پر غور کیا جائے۔

اللہ نے جگہ جگہ قرآن میں اپنی نعمتوں میں غور وفکر کی دعوت دی ہے کہ زمین کو دیکھو، آسمان کو دیکھو، سورج کو دیکھو، چاند کو دیکھو، ہماری اس نعمت کو دیکھو، ہماری اُس نعمت کو دیکھو، کہیں سمندر کا ذکر ہے، کہیں ستاروں کا ذکر ہے، اور کہیں پھلوں اور پھولوں کا ذکر ہے، اور کہیں خود انسان کے اندر کی چیزوں کا ذکر ہے، ان سب چیزوں میں غور وفکر کیا جائے کہ یہ اللہ تعالی کی نعمتوں میں غور وفکر اللہ تعالی کی محبت پیدا کر دیتا ہے، اور ان شاء اللہ اس سے اللہ تعالیٰ سے بے حد محبت پیدا ہو جائے گی۔

جب باپ سے اس لیے محبت ہے کہ وہ ہمیں نعمتیں دیتا ہے، ہماری رکھوالی کرتا ہے، ہماری نگہبانی کرتا ہے، ہماری تربیت وکفالت کرتا ہے، تو پھر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور وفکر کریں گے تو کیا اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں پیدا ہوگی؟ ضرور پیدا ہو جائے گی، اس لیے کچھ دیر آدمی کو چاہئے کہ اللہ کی محبت کی نیت سے غور وفکر کرے

ان نعمتوں میں، کبھی کسی نعمت میں کرلے، تو کبھی کسی اور نعمت میں کرلے۔

امام غزالیؒ کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے ''رموزِ کائنات'' انہوں نے اس میں اس کائنات کی مختلف چیزوں کے اسرار بیان کیے ہیں، زمین اللہ نے کیوں پیدا کی؟ اس کی کیا خصوصیات ہیں؟ اس کے اندر کیا حکمتیں ہیں؟ اس کے اندر کیسی عجیب وغریب چیزیں ہیں۔ آسمان کو بنایا تو اس میں کیا کیا ہے؟ سورج میں کیا ہے؟ چاند میں کیا ہے؟ اگر وہ کتاب ملے تو اس کو پڑھ لیجئے، پڑھنے کے بعد غور وفکر شروع کردیجئے۔

کتنی محنتوں کے بعد ایک لقمہ تیار ہوتا ہے:

ایک بات عرض کرتا ہوں کہ آپ کے سامنے کھانے کا ایک لقمہ آئے، روٹی کا ایک نوالہ آئے، چاول کا ایک دانہ آئے تو آپ اس پر غور کرنا شروع کردیں کہ یہ دانہ کیسے پیدا ہوتا ہے، اس کے اوپر کیسی کیسی محنتیں ہوئی ہیں، اللہ کے فرشتوں نے اس پر کام کیا، اللہ کی ہواؤں نے اس پر کام کیا، اللہ کے سورج نے اس پر کام کیا، اللہ کے بنائے ہوئے انسانوں نے اس پر کام کیا، اس کے اوپر جانوروں نے کام کیا، اس کے اوپر نہ معلوم اور کتنی مخلوقات نے کام کیا ہے۔ ان ساری مخلوقات کے کام کرنے کے بعد وہ چیز پیدا ہوئی اور پیدا ہوکر جب سامنے آئی، پھر اس کی کٹائی ہوئی، کاٹنے والے کچھ لوگ تھے، پھر اسکی صفائی ہوئی، صفائی کرنے والے دوسرے لوگ تھے، پھر اس کے بعد بٹائی ہوئی، بٹائی کرنے والے تیسرے قسم کے لوگ تھے، پھر وہاں سے کہیں اور بازار میں آیا، اس کو خریدنے والے کوئی اور لوگ تھے، پھر وہاں سے دوکانوں میں اور اپنے اپنے محلوں میں آیا، وہاں پر لانے والے کچھ اور لوگ تھے، پھر وہاں سے ہم نے خریدا اور پھر ہمارے گھروں میں وہ دانہ آیا، پھر عورتوں

نے اس کو پکایا اور اس کے بعد ہمارے سامنے آیا تو مزید ار لقمہ بن کر آیا۔

غور فرمایا جائے کہ ایک نوالہ کے لیے اتنی مخلوقات کو خدا نے لگا دیا اور اور مسخر کر دیا کہ یہ کام کریں، ہواؤں کو مسخر کیا، سورج کو مسخر کیا اور جانوروں کو مسخر کیا، فرشتوں کو مسخر کیا اور انسانوں کو مسخر کیا اور ان سب کی محنتوں کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ چیز ہمارے سامنے لائی ہے اور ہم اس کو مزے لے کر کھاتے ہیں، غور کرو کہ ہمارے خالق نے ایک دانہ ہم تک پہنچانے کے لئے کتنی مخلوقات کو اس کے پیچھے لگا دیا اور ہم ہیں کہ بغیر غور وفکر کئے اللہ کی نعمتوں کو استعمال کرتے ہیں، کیا ان میں غور وفکر کرنے سے اللہ کی محبت پیدا نہیں ہوگی؟ ضرور پیدا ہوگی۔

کھانے کا عجیب نظام قدرت:

اللہ کی نعمتوں میں سے ایک چیز پر غور کیجئے، وہ یہ کہ جب ہم کھانا کھاتے ہیں تو کھانا حلق کے ذریعہ اندر جاتا ہے، اس کا بھی اللہ نے عجیب نظام بنایا ہے، اللہ نے حلق میں دو نالیاں آگے پیچھے بنائی ہیں، سامنے ایک نالی ہے اور اس کے پیچھے دوسری نالی ہے، پیچھے کی نالی ہے کھانے پینے کے لئے ہے، اس سے کھانا پانی اندر جاتا ہے، اور سامنے کی جو نالی ہے وہ سانس کی نالی ہے، یہ نالیاں بازو باز و نہیں، بلکہ آگے پیچھے بنائی گئی ہیں اور اس سانس کی نالی میں ایک قطرہ پانی چلا جائے تو آدمی کے لیے خطرہ ہی خطرہ ہے۔ وہ قطرہ خطرہ بن جائے گا، ایک دانہ اگر اس کے اندر گھس جائے، سانس رک جائے گی اور آدمی کا دم گھٹ جائے گا، ہوسکتا ہے کہ اس کا نتیجہ موت ہو، اسی سامنے کی نالی کو پار کر کے کھانا پیچھے کی نالی میں جانا ہے۔ اب ذرا غور کیجئے کہ اللہ نے اس کے لیے کیا طریقہ رکھا ہے؟ حلق کے سامنے ایک چھوٹی سی جیب لگا رکھی ہے، جب آدمی لقمہ منہ کے اندر رکھتا ہے اور حلق میں اتارنے کی

کوشش کرتا ہے تو وہ جیب سامنے والی نالی پر پل کی طرح پڑ جاتی ہے اور اس کو بند کر دیتی ہے اور وہ لقمہ اس پل کے اوپر سے پار ہو کر حلق کے اندر داخل ہوتا ہے۔

اب تھوڑی دیر اس پر غور کیجئے کہ ہمارا وہ خالق کیسا ہوگا، ہمارا وہ مالک کیسا ہوگا، جس نے ایسا عجیب وغریب نظام ہماری حفاظت کا بنایا، جس میں خطرہ ہی خطرہ ہے، یہ غذا ہی ہماری بقا کا ذریعہ ہے، لیکن خطرہ سے دوچار ہے، حالانکہ اگر اللہ چاہتے تو کیا ایسا نہیں کر سکتے تھے کہ سامنے کی نالی کو پیچھے اور پیچھے کی نالی کو سامنے کر دیتے، تو سامنے کی نالی سے کھانا آسانی سے پار ہو جاتا، پیچھے کی نالی اندر سے سانس کے لیے رکھ دی جاتی، اس میں کوئی خطرہ کی بات نہ تھی اور ایسا کرنا اللہ کو کیا مشکل تھا؟ جو اللہ سانس کی نالی کو سامنے اور لقمہ جانے کی نالی کو پیچھے رکھ سکتا ہے وہ اللہ اس کا برعکس بھی تو کر سکتا ہے، لیکن اللہ نے یہ بتانا چاہا ہے کہ میں قادر مطلق ہوں، میں جو چاہے کر سکتا ہوں، اس لیے سب انسانوں کے لیے بقاء کا نظام ایسا بنایا کہ سامنے کی نالی سانس کے لیے بنائی، پیچھے کی نالی کھانے کے لے بنائی، جب بھی نوالہ جائے گا تو وہ سامنے کی نالی بند ہوگی، جب نوالہ پاس ہو جائے گا تو کھل جائے گی، یہ نظام ہے اللہ تعالیٰ کا، اس نظام پر غور کریں، اور اس کا شکر بجالائیں۔

ناشکری ناسمجھی کا نتیجہ:

اللہ کی ایسی نعمتوں کو استعمال کرنے کے باوجود بہت سارے لوگ اللہ کی ناشکری کرتے ہیں اور شکوہ شکایت کرتے ہیں، ایک صاحب جو مولانا بھی ہیں مجھ سے کہنے لگے کہ میرے بہت سے کام رکے ہوئے ہیں، میں جو کام بھی سوچتا ہوں ، اور جو بھی کرنا چاہتا ہوں، اس میں کچھ نہ کچھ پریشانی آجاتی ہے اور وہ کام نہیں ہوتا۔

میں نے کہا کہ آپ کا یہ جملہ غلط ہے کہ جو بھی آپ سوچتے ہیں نہیں ہوتا، اور یہ ناشکری ہے اللہ کی نعمتوں کی، جو دن رات آپ کی طرف متوجہ ہیں، میں نے ان سے کہا کہ آپ سوچئے آج صبح آپ بیدار ہوئے ہوں گے تو آپ نے چاہا ہوگا کہ میں بستر پر سے اٹھوں، اور اٹھ گئے، پھر اٹھنے کے بعد آپ نے سوچا ہوگا کہ یہاں سے چلوں اور بیت الخلاء جاؤں، اور چلے گئے تھے، پھر چاہا ہوگا کہ جو کچھ گندگی ہے اسے خارج کروں، وہ کام بھی ہوگیا تھا، پھر سوچا ہوگا کہ پانی اٹھاؤں تو ہاتھ اُٹھے ہوں گے، پانی ملا ہوگا، اور وضوء کیا ہوگا۔

آدمی اس پر غور نہیں کرتا کہ میری مرضی کے مطابق اللہ تعالی کیا کیا کام میرے کردیتے ہیں؟ ہم گردن کو ادھر ادھر دیکھنے کے لئے حرکت دینا چاہتے ہیں تو ادھر اور ادھر اس کو گھماتے ہیں، اگر یوں ہوتا کہ گردن گھومنے اور حرکت کرنے سے انکار کردیتی تو ہم کیا کرلیتے؟ ہم ہاتھ اُٹھانا چاہتے ہیں اور وہ اُٹھ جاتا ہے، اگر وہ نہ اُٹھتا یا اُٹھانے کے بعد نیچے نہ آتا تو کیا کرلیتے؟ انگلیاں کھلتی اور بند ہوتی ہیں، اگر یہ کھل جاتیں بند نہ ہوتیں تو کیا کرلیتے یا بند ہوجاتیں، نہ کھلتیں تو کیا کرلیتے؟ سوچئے اس طرح ہم دن رات میں کتنی حرکتیں کرتے ہیں اور سب ہم اپنی مرضی سے کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس پر اپنی رحمت اور کرم کی وجہ سے ہمارا ساتھ دیتا ہے، اس طرح آپ صبح سے شام تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عنایتیں ہیں، اس پر ذرا غور کیجئے، اور پھر یہ سوچئے کہ آپ جو یہ کہہ رہے ہیں کہ میرا کوئی کام نہیں ہوتا یہ حقیقت سے کس قدر دور ہے۔ لاحول ولاقوۃ یہی تو اللہ تعالی کی نعمتوں کی ناقدری وناشکری ہے۔

۞ انسان بڑا ہی ناشکرا ہے:

اسی لئے اللہ تعالی نے قرآن کریم میں فرمایا ہے:

﴿ وَالْعٰدِیَاتِ ضَبْحاً فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحاً فَالْمُغِیْرٰتِ صُبْحاً فَأَثَرْنَ بِہٖ نَقْعاً فَوَسَطْنَ بِہٖ جَمْعاً إِنَّ الْإِنسَانَ لِرَبِّہٖ لَکَنُوْدٌ ﴾ (ہانپتے ہوئے دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم، پھر ٹاپ مارکر آگ جھاڑنے والے گھوڑوں کی قسم، پھر صبح کے وقت دھاوا بولنے والے گھوڑوں کی قسم، پس اس وقت گردوغبار اڑاتے ہیں، پھر اسی کے ساتھ فوجوں کے درمیان گھس جاتے ہیں، یقیناً انسان بڑا ناشکرا ہے) [العدیت]

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے گھوڑوں کی قسم کھا کر فرمایا کہ انسان بڑا ناشکرا ہے، کیونکہ گھوڑا اپنے آقا و مالک کا اتنا فرمانبردار ہوتا ہے کہ وہ اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر میدان جہاد میں فوجوں کے درمیان گھس پڑتا ہے، اور مالک کے ایک اشارے پر اپنی جان کو بھی ہلاکت میں ڈال دیتا ہے، کیوں؟ اس لئے کہ اس کا یہ مجازی مالک اس کو کھانا دیتا ہے اور اسکے آرام کا کچھ سامان کر دیتا ہے، لیکن انسان گھوڑے سے بھی گیا گزرا ہے کہ وہ اپنے رب کی ہزارہا نعمتیں کھاتا ہے استعمال کرتا ہے، اسی میں اس کی صبح و شام ہوتی ہے، پھر بھی وہ بڑا ناشکرا ہے، اللہ کا شکوہ کرتا ہے اور اطاعت کے موقعہ پر اطاعت نہیں کرتا۔

بھائیو! اللہ تعالیٰ اس سورت میں انسانوں کی شکایت فرمارہے ہیں کہ وہ ہماری قسم ہاقسم کی نعمتیں کھا کر بھی اطاعت نہیں کرتا اور ناشکری کرتا ہے۔

ٹھنڈے پانی کی قدر جہنمیوں سے پوچھو:

اللہ کی ہر نعمت عجیب اور نہایت قیمتی ہے، پانی کی نعمت کیا کم ہے؟ یہ نعمت ہم روزانہ استعمال کرتے ہیں، مگر ہمیں اس کی کوئی قدر نہیں، اس کی قدر جہنمی لوگوں سے پوچھو، جن کو صرف گرم گرم کھولتا ہوا پانی ملے گا، حضرت عبد اللہ بن عمر نے ایک بار

ٹھنڈا پانی پیا اور رونے لگے اور رونا بھی شدید ہو گیا تو پوچھا گیا کہ کیا بات ہے؟ تو فرمایا کہ مجھے ایک آیت یاد آ گئی، "وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ" (اور ان کافروں اور ان کی خواہشوں کے درمیان آڑ لاگ دی جائے گی)، میں نے اس سے سمجھا کہ جہنمی لوگ صرف ٹھنڈا پانی چاہیں گے۔ (شعب الایمان: ۱۴۹/۴)

مطلب یہ ہے کہ جہنمی لوگوں کو خواہش ہوگی ٹھنڈے پانی کی تو ان سے اس کو ہٹا دیا جائے گا، ان کو نہیں دیا جائے گا، حضرت عبداللہ بن عمر اس کو یاد کر کے روتے تھے کہ آج یہ عظیم نعمت ہم کو مل رہی ہے مگر ہم اس کی قدر نہیں کرتے۔

ٹھنڈے پانی کا شکر بھی ہم سے نہیں ہوسکتا:

یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ہم نہیں کر پاتے، ہمارے اندر اس کی قابلیت ہی نہیں ہے۔

حضرت حسن بصری کے زمانے میں ایک شخص نے زہد کی راہ اختیار کی اور کہا کہ میں خبیص جو کہ ایک قسم کا حلوا گھی اور کھجور سے بنتا ہے اور فالودہ نہیں کھاؤں گا، کیونکہ میں ان نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکتا، حضرت حسن بصری کے سامنے اس کا ذکر کیا گیا تو فرمایا کہ یہ تو احمق ہے، کیا وہ ٹھنڈے پانی کا شکر ادا کر سکتا ہے؟ (شعب الایمان: ۱۳۹/۴)

جب ٹھنڈے پانی کا بھی شکر ہم سے نہیں ہوتا تو کسی اور کا کیا ہوگا؟ اس لئے جس قدر ہو سکے اتنا تو آدمی بندہ ہونے کی حیثیت سے کرے۔

ہر مومن کے دل میں اللہ کی محبت ہوتی ہے لیکن:

ایک بات یہاں سمجھ لیجئے کہ وہ مومن نہیں ہے جس کے دل میں اللہ کی محبت نہ

ہو، جب ہمارے دلوں میں ایمان ہے تو تھوڑی بہت محبت تو ضرور ہوگی، لیکن بعض لوگوں کی محبت راکھ کے ڈھیر میں اندر چھپ گئی ہے، اور بعض کی محبت راکھ سے باہر ہے اور ہوا اس کو اپنے جھونکوں سے بھڑکا رہی ہے اور ہر چیز میں وہ نظر آرہی ہے، ذکر کر رہا ہے تو اس میں بھی اللہ کے محبت کی جھلک ہے، نماز پڑھ رہا ہے تو اس کے اندر بھی محسوس ہو رہی ہے، اور اسی طرح اس کی چال ڈھال سے معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت والا ہے، اس لیے کہ اللہ کی محبت بھڑک رہی ہے۔ بعضوں کی محبت ایسی ہے کہ راکھ کے ڈھیر کے اندر چھپ گئی ہے، راکھ کے ڈھیر کے اندر سے نکال کر اس کو ذرا ہوا کا جھونکا دیا جائے تو انشاء اللہ وہ بھی بھڑکنے لگے گی۔

پہلے زمانے میں لکڑی کے چولہے جلتے تھے، اب بھی بہت جگہ جلتے ہوں گے، قریوں میں، دیہاتوں میں، تو وہاں ایسا ہوتا ہے کہ عورتیں کھانا پکانے کے بعد ایک انگارا اٹھا کر راکھ کے ڈھیر کے اندر چھپا دیتی ہیں؛ کیوں چھپاتی ہیں؟ اس لیے کہ دوسرے وقت کا کھانا جب پکانا ہوتا ہے تو اس کو باہر نکال کر ذرا سی پھونک لگاؤ تو پھر آگ بھڑک جاتی ہے، اور مستقل تیاری کی ضرورت نہیں پڑتی، اس لیے راکھ کے ڈھیر میں اس کو چھپا کر رکھ دیتی ہے۔

اس طرح بہت سارے لوگوں کی محبت الٰہیہ راکھ کے ڈھیر کے اندر چھپ جاتی ہے۔ یہ راکھ کا ڈھیر کیا ہے؟ یہ ہمارے گناہ ہیں، کوتاہیاں اور برائیاں ہیں اور دنیا کی محبتیں ہیں، دنیا کی لالچیں ہیں اور دنیا کی حرص ہے، شہوتیں ہیں اور لذتیں ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں جو ہماری محبت الٰہیہ کے اوپر آگئیں اور اس کو اندر چھپا کر رکھ دیا۔ اب ذرا آپ اس کو باہر نکالیے، اور پھر اس کو ذرا جھونکا دیجیے، جھونکا کس چیز کا؟ اللہ کے ذکر کا جھونکا دیجیے، تلاوت کا جھونکا دیجیے، تو پھر محبت الٰہیہ بھڑکنے لگے

گی اور بھڑ کنے کے بعد وہ آگ کی چنگاری اور چنگاری سے آگ کا شعلہ بن جائے گی اور سب کو جلا دے گی، آپ کے دل میں آ کر تمام لذتوں ،نفسانی خواہشوں ، نا جائز تمناؤں ،شہوتوں سب کو جلا کر خاک کر دے گی۔

پھر دیکھئے اللہ کی محبت کیسے جاگ اٹھتی ہے اور پھر جیسے اولیاء اللہ کے دلوں میں اللہ نے اپنی محبت سما دی ہمارے دلوں میں بھی آ جائے گی ،لیکن اس کے لئے محنت کی ضرورت ہے بغیر محنت کے کام نہیں ہوگا، یہ لازم ہے کہ آدمی محنت کرے، بغیر محنت اگر سو سو کر گزارے گا تو اللہ کی محبت کیسے پیدا ہو گی۔

ایک شاعر نے کہا ہے کہ:

يَا نَائِمَ اللَّيلِ مَتىٰ ترْقُدُ قُمْ ياحَبِيبِى قَد دَنَا المَوعِدُ
مَنْ نَامَ حَتّٰى يَنْقَضِيْ لَيْلُهٗ لَمْ يَبْلُغِ الْمَنْزِلَ لَوْ يَجْهَدُ

(اے سونے والے کب تک سوئے گا؟ اے میرے پیارے! وقت تو ہو گیا ہے ذرا اٹھ جا، اور جو آدمی پوری رات سو کر گزارتا ہے وہ منزل تک نہیں پہنچتا، اگر چہ کہ جدو جہد کرے)

منزل تک پہنچنے کے لیے ذرا صبح جاگنا ہے، اٹھنا ہے اور رات میں جاگ کر کچھ دیر اللہ تعالیٰ کو پکارنا ہے، پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی محبت کی چنگاری بھڑک اٹھے گی ،تو اس لیے محنت ضروری ہے۔

اصل میں اللہ ہی ہم سے محبت کرتے ہیں:

مگر ہماری یہ محنت صرف ایک علامت ہے، ورنہ اصل تو اللہ ہی ہم سے محبت کرتے ہیں ،انہی کی محبت کا اثر ہے کہ ہم اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصے بنائے

،ان میں سے ایک حصہ اللہ نے دنیا میں بھیجا اور باقی ننانوے رحمتیں اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس رکھی ہیں اور وہ قیامت کے دن کھولے گا اور اسی ایک حصہ کی وجہ سے دنیا میں ماں باپ اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں، جانور بھی اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں ، ایک آدمی دوسرے سے محبت کرتا ہے ۔(مسلم:۲۷۵۲،ترمذی :۳۵۴۱)

یہ دنیا میں جو محبتیں، الفتیں ،تعلقات اور ایک دوسرے کے ساتھ رحم وکرم اور سلوک واحسان سب چل رہا ہے،اسی ایک رحمت کی وجہ سے ہے،اب اندازہ کرو کہ ایک رحمت کا حال یہ ہے کہ لوگ محبت میں جان دینے تک تیار ہو جاتے ہیں، ماں اسی ایک رحمت کی وجہ سے بچوں پر قربان ہو جاتی ہے ،اگر بچے ذرا بیمار ہوجاتے ہیں تو رات بھر اس کی نیند حرام ہوجاتی ہے، ڈاکٹروں کے یہاں دوڑ رہی ہے ، بزرگوں سے دعائیں کرا رہی ہے ،اور تعویذات لا رہی ہے ۔تو وہ خالق و مالک جس کے پاس ایسی رحمت کے ننانوے حصے ہیں اس کی رحمت اور محبت کا کیا عالم ہوگا، وہ بندوں سے کیسی محبت کرتا ہوگا ؟

مولانا رومیؒ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرماتے ہیں ’’مادراں را مہر من آموختم‘‘ کہ اے لوگو! اور ماؤں کی محبت پر ناز کرنے والو! ماں کو محبت کرنا میں نے ہی تو سکھایا ہے، ان کے جگر میں مامتا میں نے ہی تو رکھی ہے، لہٰذا میری محبت کا کیا عالم ہوگا، ہماری محبت کو بھی سوچا کرو کہ جب ہماری مخلوق میں یہ اثر ہے تو ہم تمہارے ساتھ کتنی محبت کرتے ہیں؟

لیکن عام طور پر لوگ سوچتے نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کیسی ہے، ایسی رحمت والے پروردگار سے ہم محبت نہیں کرتے ۔

اسی لئے اللہ تعالی نے قرآن کریم میں فرمایا ہے: ﴿ وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ ﴾ (اور لوگوں نے اللہ کی کما حقہ قدر نہیں کی)

ایک علمی نکتہ:

اس پر مجھے ایک آیت کا اشارہ ذہن میں آ گیا، اللہ تعالی فرماتے ہیں:

﴿ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰہُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [آل عمران:]

(اے نبی آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ کو چاہتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ خود تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا، اللہ بڑا بخشنے والا رحم کرنے والا)

اس میں اللہ تعالی نے اولا یہ بتایا کہ اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ محمد ﷺ کی اتباع کرو، آپ کی سنتوں کو مضبوط تھام لو، پھر یہ بتایا کہ اگر تم نے ایسا کیا تو خود اللہ تم کو چاہنے لگے گا، کیونکہ ہم اللہ کو اس وقت تک نہیں چاہ سکتے، جب تک کہ اللہ ہم کو نہ چاہے۔

ایک شخص نے ایک باندی خریدی، اور اپنے گھر لایا، وہ راتوں میں اُٹھ کر نماز پڑھتی اور روتی اور مناجات کرتی تھی، بڑی اللہ والی اور عابدہ زاہدہ تھی، ایک رات اس شخص نے اس کو دیکھا کہ وہ اللہ کے سامنے رو رہی ہے اور گڑگڑا رہی ہے اور اس طرح مناجات کر رہی ہے کہ ''اے اللہ! تجھے اس محبت کی قسم جو تجھ کو مجھ سے ہے'' یہ شخص اس کو سن کر اس کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ اے عورت! اس طرح نہ کہنا، بلکہ یوں کہنا کہ اے اللہ! جو محبت مجھے تجھ سے ہے اس کی قسم، وہ باندی کہنے لگی کہ جا جا، سو جا، اگر اس کو مجھ سے محبت نہ ہوتی تو وہ تجھے کیوں سلاتا اور مجھے اپنے دربار میں کیوں بلاتا؟ اصل میں اسی کو مجھ سے محبت ہے تب جا کر میں اس سے محبت کرتی ہوں۔

اللہ اکبر! کس قدر عارف باللہ باندی تھی کہ اس حقیقت کو سمجھ لیا، کہ اصل محبت تو اسی کی جانب سے ہوتی ہے۔

ایک شرابی پر اللہ تعالیٰ کی عنایت:

حبیب عجمی ایک بزرگ گزرے ہیں، وہ ایک دفعہ دریائے دجلہ کے کنارے پر بیٹھے ہوئے وضو کر رہے تھے، تو وہاں ان کو ایک عجیب تماشا نظر آیا، وہ یہ کہ ایک بڑا کچھوا تھا، ایک بچھو دوڑتے ہوئے آ کر اس کی پشت پر بیٹھ گیا، اور کچھوا چل کر پانی میں کود گیا، اب یہ کچھوا اسے لے کر چلنے لگا، ان کو بڑا تعجب ہوا، دل میں خیال آیا کہ کوئی نہ کوئی بات اللہ تعالیٰ کی حکمت کی ظاہر ہونے والی ہے، اس لیے چلو اس کے پیچھے جائیں گے، دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے۔

چنانچہ فوراً ایک کشتی میں بیٹھے اور اسی رخ پر یہ بھی چلنے لگے، دیکھا کہ اس کنارے سے اس کنارے ساحل پر وہ گیا اور کچھوا تو ایک جگہ ٹھہر گیا اور وہ بچھو وہاں سے اُتر کر جلدی جلدی دوڑنے لگا، حبیب عجمی بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگے کہ دیکھیں کہاں جاتا ہے، کچھ دیر بعد دیکھا کہ وہ بچھو جا رہا ہے اور دوسری طرف ایک شرابی آدمی شراب کے نشے میں چور وہاں پر پڑا ہوا ہے، اسے کچھ خبر نہیں اور اس کے قریب تک ایک سانپ آ گیا ہے، جو اس شرابی کو کاٹنے کے در پے ہے۔ یہ بچھو گیا اور سانپ پر حملہ کر کے اس کو مار دیا، سانپ مر گیا، بچھوا سے مار کر واپس چلا گیا۔

حبیب عجمی اللہ تعالیٰ کے دربار میں مناجات کرتے ہوئے سر بہ سجود ہو گئے اور کہنے لگے کہ اے اللہ! تیرا کیسا رحم ہے، کیسا کرم ہے، کیسا فضل ہے، کیسا احسان ہے کہ شرابی کو بچانے کے لیے اتنا بڑا انظام چلا رہا ہے، ادھر سے سانپ آ کر اسے کاٹنے

والا ہے، اس سانپ کو مارنے کے لیے بچھو کو دوسری جگہ سے بھیجا جاتا ہے، اور اس کی سواری کچھوے کو بنایا جاتا ہے، جو ایک دریا کے کنارے سے دوسرے کنارے تک اس کو پہنچاتا ہے، تو رو رو کر اللہ تعالیٰ کی تعریفیں بیان کرنے لگے، اتنے میں وہ سویا ہوا آدمی جاگ اٹھا، دیکھا تو یہ بزرگ حبیب عجمی ہیں، کہنے لگا کہ حضرت! آپ یہاں کیسے آئے؟ تو انہوں نے کہا کہ دیکھ بھائی! میں نے ایک عجیب وغیب تماشہ دیکھا ہے، اللہ نے تیری حفاظت کے لیے ایسا ایسا کیا ہے، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، یہ دیکھ سانپ مرا پڑا ہے، جو تیرے سر تک کاٹنے کے لیے آ گیا تھا، اگر ذرا بھی تاخیر ہوتی تو تجھے یہ ڈس لیتا، لیکن اللہ نے فوراً ایک بچھو کے ذریعہ اس کو ختم کرایا اور تیری حفاظت کی، یہ سن کر وہ شرابی بھی رونے لگا اور اللہ تعالی کی اس عجیب وغریب رحمت پر شکر بجالایا اور اپنے گناہوں سے تائب ہو گیا۔

بہر حال اللہ تعالی سے محبت کرنا ہمارا فرض ہے اور دنیا اور دنیا کی چیزوں سے لو نہ لگانا بھی اس کے لئے ضروری ہے۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالی ہم سب کو اپنی محبت کاملہ عطاء فرما کر اپنے محبوبین میں شامل فرمالے۔

و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عشق رسول اور اس کے تقاضے

الحمدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ، اَمَّا بَعْدُ: فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ ﷺ: لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ نَفْسِہٖ وَوَالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔

❁ محبت الٰہیہ کی دو قسمیں:

محبت الٰہیہ کی دو قسمیں ہیں: ایک کو محبت فی اللہ کہتے ہیں اور ایک کو محبت للہ کہتے ہیں، محبت فی اللہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے محبت کی جائے، اور محبت للہ کا مطلب یہ ہے کہ کسی نیک و صالح بندے سے اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت کی جائے۔

جن بندوں سے اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت کی جانی چاہئے، ان میں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام، حضرات صحابہ کرام علیہم الرضوان، حضرات ائمہ وفقہاء عظام اور حضرات اولیاء کرام علیہم الرحمۃ کی ذوات مقدسہ داخل ہیں، پھر ان میں سے سب سے اولین درجہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو حاصل ہے، بلکہ ان سے محبت ایمان کا جزء لازم ہے، پھر حضرات انبیاء کرام میں سے بھی سب سے مقدم واہم ہمارے اور آپ کے مقدس ومحترم نبی سرور کائنات فخر موجودات رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کی ذات والا صفات ہے۔

❁ عشقِ نبوی، اصل ایمان ہے:

اس لئے حضرت سرور عالم محبوب دوعالم ﷺ سے عشق ومحبت، ایمان کے لیے

لازم اور ضروری ہے، کوئی شخص اس وقت تک ایمان دار اور مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ آپ اسے محبت نہ کرے اور محبت بھی کیسی؟ ایسی کہ دنیا کے تمام رشتے وتعلقات اس پر قربان ہوں، مال ودولت اس پر نثار اور دل وجان اس پر نچھاور ہوں، ماں باپ، بھائی بہن، بیوی بچے، رشتہ دار واحباب سب ایک طرف اور حضرت نبی کریم ﷺ کی محبت ایک طرف ہو، تو مؤمن کی شان یہ ہے کہ وہ ان سب کے مقابلہ میں آپ کی محبت کو ترجیح دیتا ہے، مال ودولت کے انبار ہوں، زیب وزینت کی بہار ہو، آرام وراحت کے اسباب ہوں، مزیدار کھانے اور مشروبات ہوں، خوش منظر ملبوسات ہوں، شاندار وفلک بوس عمارات ہوں، ہر چیز کو وہ محبت وعشق نبوی میں قربان کرنا اپنا فریضہ سمجھتا ہے اور اسی کے ساتھ اس کی طبیعت بھی اسی کا اقتضاء کرتی ہے۔

میں نے ابھی جو حدیث آپ کے سامنے پڑھی ہے اس میں اسی بات کو ان الفاظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے:

"لَا یُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی أَکُوْنَ أَحَبَّ إِلَیْهِ مِنْ وَالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِیْنَ" (تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے ماں باپ، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں۔ (بخاری:۱۴، مسلم:۶۳)

ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کوئی بندہ (یا یہ فرمایا کہ) کوئی آدمی مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ مجھے اپنے اہل وعیال و مال سے زیادہ محبوب نہ رکھے۔ (مسلم:۱/۴۹)

حضرت عمرؓ کا واقعہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی جناب میں عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ مجھے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں، سوائے میرے نفس کے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا نہیں، خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم مومن نہیں ہوسکتے جب تک کہ میں تمہارے نفس سے زیادہ تم کو محبوب نہ ہوجاؤں۔ پھر حضرت عمر نے فرمایا کہ خدا کی قسم اب آپ مجھے میری ذات سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں! اب (ایمان مکمل ہوا) اے عمر۔ (بخاری: ۲/۹۸۱)

ان تمام احادیث سے یہ بات نکلتی ہے کہ ہر چیز سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کی محبت ہونا چاہئے اور یہ ایمان کا تقاضا ہے، بلکہ اصل ایمان ہے۔

علامہ نوویؒ ایک عظیم محدث گذرے ہیں، جنہوں نے مسلم شریف کی شرح لکھی ہے، اور دیگر بہت سی حدیثی خدمات انجام دی ہیں، انہوں نے شرح مسلم میں لکھا ہے کہ:

’’قاضی عیاض نے فرمایا کہ ایمان کی حقیقت بغیر محبت نبوی کے مکمل نہیں ہوتی اور سول اللہ ﷺ کی قدر ومنزلت کو ہر والد، ہر بچے، ہر فضل واحسان کرنے والے کی قدر ومنزلت پر بلند کیے بغیر ایمان صحیح نہیں ہوتا، اور جو شخص اس بات پر عقیدہ نہ رکھے اور اس کے علاوہ پر اعتقاد رکھے تو وہ مؤمن ہی نہیں ہے۔‘‘ (شرح مسلم: ۱/۴۹)

معلوم ہوا کہ حب نبی اصل ایمان ہے، جس طرح اللہ کی محبت اصل ایمان ہے اور جیسے محبت الٰہی کے بغیر ایمان صحیح نہیں ہوتا، بالکل اسی طرح محبت نبوی کے بغیر ایمان کا تحقق نہیں ہوتا۔

محبت کی تین قسمیں، شرح حدیث:

ابھی جو احادیث میں نے نقل ہیں، ان میں غور کیجئے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مومن کو اپنے والد، اپنی اولاد اور دیگر تمام لوگوں کی محبت سے زیادہ آپ سے محبت رکھنے کا حکم فرمایا ہے، یہاں ان تین قسم کے لوگوں کا ذکر کر کے ایک اہم نکتہ کی جانب اشارہ کیا ہے۔

وہ یہ کہ علامہ ابن بطال، قاضی عیاض وغیرہ حضرات نے بیان کیا ہے کہ محبت تین قسم کی ہوتی ہے:

(۱) محبت عظمت (۲) محبت شفقت (۳) محبت احسان۔

محبتِ عظمت جیسے بچوں کو بڑوں سے محبت ہوتی ہے، مثلا باپ دادا، استادو پیر وغیرہ بڑوں سے جو محبت ہوتی ہے یہ محبت عظمت کی بنا پر ہوتی ہے، اسی کو محبت عظمت کہتے ہیں۔ اور محبت شفقت وہ محبت ہے جس کی بنا شفقت و پیار ہو، جیسے اپنی اولاد اور دیگر بچوں بڑوں کو جو محبت ہوتی ہے وہ شفقت و پیار کی بنا پر سے ہوتی ہے، یہی محبت شفقت ہے۔ اور محبت احسان جس کی بنا احسان و کرم ہوتا ہے، جیسے عام لوگوں کو ایک دوسرے سے ہوتی ہے کہ کسی نے احسان کیا تو اس سے محبت ہوگئی۔

علماء نے فرمایا کہ حدیث میں والد کا ذکر کر کے محبت عظمت کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ محبت عظمت سب سے زیادہ مجھ سے ہونا چاہئے، اور جو اس محبت میں دوسروں کو مجھ پر ترجیح دے وہ کامل ایمان والا نہیں۔ اور اولاد کا ذکر کر کے محبت شفقت کی جانب اشارہ کرنا مقصود ہے کہ محبت شفقت بھی سب سے زیادہ مجھ سے ہونا چاہئے۔ اور دیگر لوگوں کے تذکرہ سے مقصود یہ بتانا ہے کہ جس طرح لوگ ایک دوسرے سے احسان و فضل کی وجہ سے محبت رکھتے ہیں، یہ محبت

احسان بھی مجھ سے غالب ہونا چاہئے۔ (شرح مسلم: ۴۹/۱)

ایک اور نکتہ:

علماء کے اس کلام میں باپ، اولاد اور دیگر لوگوں سے محبت پر حضور سرور عالم ﷺ کی محبت کو غالب کرنے کے بارے میں حدیث میں مذکور ان تین قسم کے لوگوں کی تخصیص کی حکمت بتائی گئی ہے، مگر بعض اور روایات میں جو اہل و مال اور نفس کا ذکر آتا ہے اس سے کس جانب اشارہ ہے؟ احقر کے خیال میں یہ آتا ہے کہ نفس سے اشارہ ناجائز خواہشات کی طرف اور مال سے تمام دنیوی ساز وسامان و اسباب کی طرف ہے اور اہل یعنی بیوی سے تمام جائز خواہشات کی طرف اشارہ ہے، تو حدیث کا حاصل یہ ہے کہ تمام جائز و ناجائز خواہشات اور تمام دنیوی اسباب و ساز وسامان پر جب تک نبی کریم ﷺ کی محبت کو ترجیح نہ دے گا، کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا۔

محبت عقلی و طبعی میں کون افضل ہے؟

میں عرض کرتا ہوں کہ یہاں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ حدیث میں نفس سے اشارہ محبت طبعی کی طرف ہو، اور دوسری چیزوں سے اشارہ محبت عقلی کی طرف ہو، اور اس احتمال پر یہاں ایک بحث یہ پیدا ہوجاتی ہے کہ نبی کریم ﷺ سے جو محبت ہونا چاہئے وہ محبت طبعی ہے یا محبت عقلی؟ جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ مراد محبت عقلی و محبت ایمانی ہے، محبت طبعی مراد نہیں۔ (فتح الباری: ۵۹/۱، شرح مسلم: ۴۹/۱، مرقات: ۷۳/۱)

جمہور علماء کا کہنا یہ ہے کہ محبت طبعی غیر اختیاری ہوتی ہے اور پھر محض ایک جذباتی چیز ہے جس کو پائیداری حاصل نہیں، اس لیے انسان اس کا مکلّف نہیں

ہوسکتا اور اس کے برخلاف محبت عقلی اختیاری بھی ہوتی ہے اور پائیدار بھی ہوتی ہے، اس لیے محبت عقلی ہی مراد ہے اور افضل بھی وہی ہے۔

مگر حضرات صوفیاء میں سے بعض کہتے ہیں کہ قرآن وحدیث میں اللہ ورسول سے محبت سے مراد محبت طبعی ہے اور وہ حضرات اسی کو افضل قرار دیتے ہیں، مگر اس سلسلہ میں میرے مرشد روحانی حضرت مسیح الامت ایک گہری بات فرمائی ہے، وہ یہ کہ محبت طبعی مطلوب نہیں، بلکہ محبت عقلی مطلوب ہے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ حب عقلی والوں یعنی کاملین میں حب طبعی نہیں ہوتی بلکہ مطلب یہ ہے کہ غلبہ حب عقلی کو ہوتا ہے، باقی جن پر حب عقلی کا غلبہ ہوتا ہے بعض اوقات ان میں محبت طبعی بھی ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے جن پر محبت طبعی کا غلبہ ہے، مگر وہاں محبت طبعی پر حب عقلی غالب ہوتی ہے، اس لیے جوش دبا رہتا ہے، لیکن گاہے گاہے کاملین پر بھی حب طبعی کا غلبہ ہوتا ہے۔

بہرحال کاملین تو حب عقلی اور حب طبعی دونوں کے جامع ہوتے ہیں، مگر ان میں غلبہ عقلی کو ہوتا ہے، اور ناقصین میں حب طبعی کا غلبہ ہوتا ہے، یہ کمال گو مطلوب نہیں مگر محمود ضرور ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ افضل واعلیٰ اور مامور بہ تو محبت عقلی ہی ہے، البتہ محبت عقلی سے پھر محبت طبعی بھی عموماً پیدا ہوجاتی ہے، گویا محبت عقلی کے بعد محبت طبعی کا بھی حاصل ہوجانا، یہ انتہائی کمال اور انتہائی محبت وعشق کی بات ہے۔

حضرت عمرؓ کے واقعہ کی شرح:

اور غالباً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں جو ابھی عرض کیا گیا، اسی کی

جانب اشارہ ہے، حضرت عمرؓ کا واقعہ اوپر عرض کر چکا ہوں کہ آپ نے ایک دفعہ نبی کریم ﷺ کی جناب میں عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ مجھے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں، سوائے میرے نفس کے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا نہیں، خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ میں تمہارے نفس سے زیادہ تم کو محبوب نہ ہو جاؤں۔ اس پر حضرت عمر نے فرمایا کہ خدا کی قسم! اب آپ مجھے میری ذات سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اب (ایمان مکمل ہوا) اے عمر۔

اس واقعہ میں علماء محدثین نے کافی کلام کیا ہے، بعض نے فرمایا کہ حضرت عمر ؓ نے پہلے تو یہ سمجھا کہ محبت طبعی مامور بہ ہے اور میں اپنے اندر نفس کے بارے میں اس کو نہیں پاتا، لہذا اولاً یہ عرض کیا کہ سوائے میرے نفس کے آپ مجھے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں، مگر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنی ذات سے بھی زیادہ مجھ سے محبت نہ رکھو، تو حضرت عمرؓ سمجھ گئے کہ مراد محبت عقلی ہے اور وہ اپنی ذات کے اعتبار سے بھی حضور ﷺ ہی سے زیادہ ہے، تو دوبارہ عرض کیا کہ میں میری ذات سے بھی زیادہ آپ سے محبت رکھتا ہوں۔ (دیکھو فتح الباری: ۱۱/۵۲۸، مرقات: ۱/۴۷)

اور حضرت ملا علی قاری نے ایک توضیح یہ بیان کی ہے اور واقعی بڑی لطیف توضیح وعجیب بات فرمائی ہے، وہ یہ کہ حضرت عمرؓ کو محبت عقلی وایمانی تو حضور سرور عالم ﷺ سے ایسی حاصل تھی کہ کسی چیز حتی کہ ذات سے بھی ایسی نہیں تھی اور یہی محبت عقلی مؤمن پر فرض وواجب ہے۔ البتہ محبت طبعی اپنی ذات سے زیادہ نہ تھی لہذا حضرت عمرؓ نے اس کی شکایت رسول اللہ ﷺ سے کی کہ مجھے ہر چیز سے زیادہ آپ سے طبعی

طور پر بھی محبت ہے جیسے عقلی طور پر ہے، البتہ اپنی ذات سے طبعی محبت آپ کی محبت پر غالب پاتا ہوں، تو اس وقت نبی کریم ﷺ نے اپنی روحانی توجہ حضرت عمرؓ کی طرف فرمائی اور اس توجہ کا یہ اثر ہوا کہ حضرت عمرؓ کے دل میں آپ کی طبعی محبت بھی اپنی ذات سے زیادہ اور غالب ہوگئی اور اس بات کو آپ کے سامنے حضرت عمرؓ نے ظاہر کیا تو آپ نے فرمایا کہ اب تمہارا ایمان کامل ہوگیا۔ (دیکھو: مرقات: ۱/۴۷)

غرض یہ کہ درجۂ فرض میں تو محبت عقلی مراد ہے اور درجۂ استحسان میں محبت طبعی مراد ہے۔ لہٰذا چاہئے کہ ہم نبی کریم ﷺ سے ایسی محبت رکھیں کہ کسی سے ایسی محبت نہ ہو، آپ کی محبت کے سامنے ہر چیز ہیچ ہو، لغو ہو، بے حیثیت ہو، بے وقعت ہو۔

آپ علیہ السلام سے محبت غالبہ کا مطالبہ:

اسی لیے قرآن نے آپ سے محض محبت کا مطالبہ نہیں کیا، بلکہ آپ سے محبت غالبہ رکھنے کا مطالبہ کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

﴿قُلْ إِن كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُواْ حَتَّى يَأْتِيَ اللّهُ بِأَمْرِهِ وَاللّهُ لاَ يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ﴾[التوبۃ:]

(اگر تمہارے آباء واجداد، تمہاری اولاد، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان، تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہاری وہ تجارت جس کے گھاٹے کا تم کو خطرہ ہوتا ہے اور تمہارے مکانات جس کو تم پسند کرتے ہو، یہ سب چیزیں اگر تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اللہ کے راستے میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو تم انتظار کرو کہ اللہ اپنا حکم (عذاب) لے آئے اور یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ فاسقوں کو ہدایت

نہیں دیتا)

علامہ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ یہ آیت حضور کی محبت کے لازم ہونے ،فرض ہونے اوراس کے عظیم ہونے اور محبت کے آپ کے حق ہونے پر کافی طور پر دلالت وتنبیہ کرتی ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو دھمکایا ہے جوآپ سے زیادہ کسی اور کومحبوب رکھتا ہو،اوراس کووعید سنائی ہے کہ اللہ کے عذاب کا انتظار کرو۔اوران کوفاسق قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ لوگ گمراہ ہیں اوراللہ نے ان کو ہدایت نہیں دی ہے۔(شفا:۲/۱۷)

امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ یہ آیت بہت سخت ہے،اتنی سخت آیت قرآن مجید میں کوئی اورنہیں ہے،کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دوسروں کی محبت کواپنی محبت پرغالب کرنے والوں کوعذاب کی دھمکی دی ہے۔معلوم ہوا کہ بہت سخت بات ہے کہ اللہ ورسول کی محبت کوچھوڑ کرکسی اور کی محبت کوزیادہ کرلیاجائے،غالب کرلیاجائے۔

غرض یہ کہ اس آیت میں یہ مطالبہ ہے کہ اللہ ورسول کوسب چیزوں سے زیادہ محبوب رکھو،اگراتنی ہی محبت اللہ ورسول سے کیا جتنی کہ ماں باپ سے،اپنی اولاد سے،بیوی سے،مال ودولت،تجارت وملازمت سے محبت ہےتووہ بھی اس وعید کامستحق ہے،لہٰذا آپ سے محض محبت کافی نہیں،بلکہ غالب محبت ہونا چاہئے۔

عشقِ نبوی ﷺ کا ثمرہ:

جب ایسی محبت ہوگی تواس کاثمرہ کیا ہے؟ اس کا ذکر حدیث میں ہے کہ ایک صحابیؓ ایک دفعہ نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اورعرض کیا کہ اے

اللہ کے رسول آپ مجھے میرے اہل وعیال اور مال سے زیادہ محبوب ہیں اور میں آپ کو یاد کرتا ہوں تو صبر نہیں آتا، پس میں آتا ہوں اور آپ کی زیارت کرتا ہوں اور جب میں آپ کے وصال اور میرے مرنے کو یاد کرتا ہوں تو پریشان ہو جاتا ہوں کیوں کہ جانتا ہوں کہ آپ جنت میں نبیوں کے ساتھ بلند درجات میں ہوں گے اور میں وہاں آپ کو دیکھ نہ سکوں گا۔

ان صحابی کی اس کیفیت پر جواب میں، ان کو تسلی دینے کے لئے اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿وَمَن يُطِعِ اللّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَـئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاء وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَـئِكَ رَفِيقاً﴾ [سورہ نساء:۶۹]

(اور جو اللہ ورسول کی اطاعت کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا، یعنی انبیاء کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین اور یہ لوگ بہترین ساتھی ہیں)

اس آیت کے نازل ہونے پر نبی کریم ﷺ نے ان صحابی کو بلا کر یہ آیت سنا دی۔ (تفسیر ابن:۵۲۲/۱)

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک تو یہ کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ عشق ومحبت کا ثمرہ یہ ہوگا کہ اس کو ان حضرات کی صحبت جنت میں بھی نصیب ہوگی۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ سچی محبت وہی ہے جس میں اطاعت ہو؛ کیوں کہ قرآن نے ان صحابی کے جواب میں اور ان کی تسلی کے لیے یہ فرمایا کہ جو اللہ ورسول کی اطاعت کریں گے وہ ان حضرات کے ساتھ ہوں گے، اس میں اشارہ ہے کہ محض

دعویٰ محبت وعشق سے یہ دولت نصیب نہیں ہوگی، بلکہ محبت کے ساتھ اطاعت ہوتب یہ دولت حاصل ہوگی، ورنہ اللہ تعالیٰ ان صحابی کا جواب یوں فرماتا "من یحب اللّٰہ والرسول فاولئك مع الذين انعم اللّٰه عليهم" (کہ جواللہ ورسول سے محبت کریں گے وہ ان حضرات کے ساتھ ہوں گے) مگراس کے بجائے اطاعت کا ذکرکیا۔معلوم ہوا کہ اصلی وسچی محبت وہی ہے جس میں اپنے محبوب کی اطاعت کا جذبہ ہو، یہی چیز انسان کومراتب عالیہ پر فائز کرتی ہے۔

عشق رسول کا بےنظیرنمونہ:

حضرات صحابۂ کرام کی حضرت رسول اکرم ﷺ سے محبت وعشق کا عجیب حال تھا، اوپر جوآیت ایک صحابی کے واقعہ میں پیش کی گئی، یعنی" من يطع اللّٰه والرسول" الخ اس کے شان نزول میں مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہ ؓ نے حاضرخدمت ہوکرعرض کیا کہ یارسول اللہ !جب آپ بھی انتقال فرماجائیں گےاورہم بھی مرجائیں گے،تو آپ علیین میں ہوں گے، جہاں سے ہم نہ آپ کودیکھ سکیں گے اور نہ آپ کے ساتھ جمع ہوسکیں گے، پھرانہوں نے اس پر بڑے ہی حزن اورغم کا اظہارکیا،تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی،(جس میں ہے کہ اللہ ورسول کی اطاعت جوبھی کرے گا وہ انبیاء ،صدیقین ،شہداء اورصالحین کے ساتھ ہوگا)۔

انہی حضرت عبداللہ ؓ کے بارے میں آیاہے کہ جب نبی کریم ﷺ کاوصال ہواتوانہوں نے دعا کی کہ "اَللّٰهُمَّ أَعْمِنِیْ حتّٰی لَا أَرٰی شَیْأً بعدَهٗ "(یعنی اے اللہ! مجھ کواندھا کردے تاکہ نبی کریم ﷺ کے بعدکسی چیز کونہ دیکھ سکوں)،ان کی

یہ دعاءفوراً قبول ہوئی اوراسی وقت وہ نابینا ہو گئے۔(تفسیر قرطبی: ۲۷۱/۵)

اللہ اکبر! کیا عشق تھا،محبوب دوعالم ﷺ کے ساتھ کہ آپ کے بعد اپنی آنکھوں سے کسی کو دیکھنا بھی نہیں چاہتے تھے، گویا یہ آنکھیں صرف اس لیے تھیں کہ حضور ﷺ کی ان سے زیارت کریں جب آپ کا وصال ہو گیا تو اب اس کا امکان نہ رہا تو آنکھوں کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی، وہ آنکھیں کس کام کی جن سے محبوب کا دیدار نہ ہو۔

حضرت ثوبانؓ کا عشق:

ایک اور صحابی حضرت ثوبانؓ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام ہیں، ان کا حضرت نبی کریم ﷺ کے عشق ومحبت میں یہ حال ہو گیا کہ ایک دفعہ حاضر خدمت ہوئے اور رنگ بدلا ہوا تھا اور جسم نحیف وکمزور ہو گیا تھا اور چہرہ پرغم اور حزن کے آثار نمایاں تھے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اے ثوبان! تمہارا رنگ کیوں بدلا ہوا ہے؟ حضرت ثوبان نے عرض کیا کہ نہ مجھے کوئی نقصان ہوا اور نہ درد ہے؟ لیکن بات یہ ہے کہ جب میں آپ کو نہیں دیکھتا تو بے قرار ہو جاتا ہوں اور شدید وحشت وگھبراہٹ محسوس کرتا ہوں اور جب تک آپ کو نہ دیکھ لوں اور آپ سے نہ مل لوں قرار نہیں آتا۔ جب میں نے آخرت کا معاملہ سوچا تو اندیشہ ہوا کہ میں وہاں آپ کو نہ دیکھ سکوں گا؛ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ آپ انبیاء کے ساتھ بلندترین مقام پر ہوں گے اور میں اگر جنت میں داخل بھی ہوا تو آپ کے درجہ سے کم درجہ پر رہوں گا اور اگر جنت میں داخل ہی نہ ہو سکا تو پھر کبھی بھی آپ کو نہ دیکھ پاؤں گا، یہ سوچ کر مجھ کو غم ہو گیا اور یہ حال ہو گیا ہے۔مفسرین نے لکھا ہے کہ انہی کے اس واقعہ پر وہ

آیت نازل ہوئی جواوپر پیش کی گئی ہے۔(قرطبی:۲۷۱/۵)

ایک طالب علمانہ شبہ کا جواب:

یہاں ایک طالب علمانہ شبہ پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ اوپر پیش کردہ آیت اور روایت سے معلوم ہوا کہ اللہ ورسول کی محبت کا یہ ثمرہ ہے کہ محبت رکھنے والے انبیاء و صدیقین، شہداء وصالحین کے ساتھ جنت میں رہیں گے، حالانکہ یہ بدیہی البطلان ہے؛ کیوں کہ اس سے لازم آتا ہے کہ انبیاء وغیر انبیاء کا درجہ ایک ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت وحدیث میں معیت اور ساتھ ہونے کا جو ذکر ہے اس سے مراد ایک خاص معیت اور صحبت ہے، اور وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے درجے اور منزل میں رہتے ہوئے حسب ضرورت وموقعہ آپ کی زیارت وملاقات کا شرف پاسکے گا، جیسے دنیا میں آپ کی ملاقات وزیارت سے صحابہ کرام مشرف ہوتے تھے۔

چنانچہ ملا علی قاریؒ نے فرمایا کہ اس سے مراد معیت خاصہ ہے اور وہ یہ ہے کہ جنت میں محبّ ومحبوب کے درمیان ملاقات کا موقعہ حاصل ہوگا، یہ مراد نہیں کہ وہ دونوں ایک ہی درجہ میں ہوں گے؛ کیوں کہ یہ بدیہی طور پر باطل ہے۔ (مرقات:۲۵۱/۹)

اور علامہ قرطبیؒ نے فرمایا کہ ساتھ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک مقام پر اور ایک ہی قسم کی نعمتوں میں ہوں گے اور ایک دوسرے سے ملاقات اور ایک دوسری کی زیارت سے متمتع ہوں گے۔ یہ معنیٰ نہیں کہ وہ سب درجے میں برابر ہوں گے؛ کیوں کہ ان کے درجات الگ الگ ہوں گے، لیکن وہ ایک دوسرے کی زیارت کریں گے، بوجہ اس کے کہ دنیا میں اتباع واقتداء کرتے تھے۔(قرطبی:۲۷۲/۵)

اور علامہ آلوسی بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ معیت سے مراد درجہ میں اتحاد نہیں ہے اور نہ مطلق دخول جنت میں اشتراک مراد ہے، بلکہ یہ مراد ہے کہ وہ وہاں ایسا رہیں گے کہ ان میں ہر ایک کو دوسرے کی دیدار وزیارت کا موقعہ ملے گا، اگر چہ ایک کی جگہ دوسرے سے مسافت بعیدہ پر ہو۔ (روح المعانی: ۷۸/۵)

غرض یہ کہ جن کے دل عشق ومحبت نبوی سے سرشار ہوں گے، ان کو وہاں آپ کی زیارت اور ملاقات کا موقعہ ملے گا، اسی بات کو احادیث میں معیت سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ نہیں کہ محبت والے آپ کے درجہ میں رہیں گے۔

بھائیو! مگر یہ دولت بھی کیا کم ہے کہ آپ سے محبت کے نتیجہ میں آپ کی زیارت اور ملاقات کا شرف جنت میں بھی ملتا رہے۔ خدا کی قسم اگر کچھ نہ ملتا اور جنت میں صرف یہی دولت ونعمت مل جاتی تب بھی یہ سودا بہت سستا تھا۔

اسلام کے بعد صحابہ کی سب سے بڑی خوشی:

اسی وجہ سے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اس وقت نہایت درجہ خوش ہوئے جب کہ نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ " اَلْمَرْأُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ" (آدمی جنت میں اس کے ساتھ ہوگا جس سے محبت رکھے گا)۔

اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! قیامت کب ہوگی؟ آپ نے اس سے پوچھا کہ تم نے اس کے لیے کیا تیاری کی ہے؟ ان صاحب نے عرض کیا کہ میں نے کچھ تیاری نہیں کی ہے، مگر یہ کہ میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ تم اس کے ساتھ ہوگے جس سے محبت کرتے ہو۔

حضرت انس بن مالکؓ اس حدیث کے راوی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے مسلمانوں یعنی صحابہ کرام کو نہیں دیکھا تھا کہ وہ اسلام کے بعد کسی چیز سے اس قدر خوش ہوئے ہوں جتنا کہ آپ کے اس ارشاد سے خوش ہوئے۔(مشکل الآثار:۱/۴۲۱)

ایک حدیث میں ہے کہ اس شخص نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں نے نہ روزوں کی کثرت سے، نہ نماز کی کثرت سے، نہ صدقے کی کثرت، کسی سے تیاری کی نہیں ہے، لیکن میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہوں۔(بخاری:۲/۱۰۵۹)

ابن حجر نے لکھا ہے کہ یہ صاحب جنہوں نے سوال کیا تھا، حضرت ذوالخویصرہ یمنیؓ تھے اور انہیں نے ایک دفعہ اسلام لانے سے قبل مسجد میں پیشاب کر دیا تھا۔ (فتح الباری:۱۱/۵۵۵)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرات صحابۂ کرام کے لیے یہ بہت ہی زیادہ خوشی کا موقعہ تھا جب کہ حضور اقدس ﷺ نے یہ فرمایا کہ آدمی اس کے ساتھ ہوگا جس سے محبت رکھے گا۔ اسی طرح ہر مسلمان کے لیے یہ ارشاد خوشی و سرور کا پیغام ہے اور امید کی ایک کرن ہے، ورنہ ہمارے پاس کون سا ایسا عمل ہے کہ جنت کی تمنا و آرزو کر سکیں۔

غرض یہ کہ یہ محبت بڑی دولت و نعمت ہے کہ جنت میں اللہ کے رسول علیہ السلام کی زیارت و ملاقات کا موقعہ مل جائے، مگر یہ دولت کس کو نصیب ہوگی؟ عشق و محبت نبوی میں جو سچا اور پکا ہو، اس کو یہ دولت نصیب ہوگی، لہٰذا آپ سے سچی و پکی محبت پیدا کرنا چاہئے۔

۞ آپ علیہ السلام میں تمام اسباب محبوبیت جمع ہیں:

اور کیوں نہ ہو جب کہ آپ کے اندر وہ سارے اسباب جمع ہیں جو کسی کو مقام

محبوبیت تک پہنچاتے ہیں، اور پھر ہر سبب علی وجہ الکمال آپ میں پایا جاتا ہے۔ جمال میں دیکھو تو آپ بے مثال ہیں، کمال میں دیکھو تو آپ بے نظیر ہیں، عطا و نوال میں دیکھو آپ لاثانی ہیں، آپ کی ہر چیز نرالی و عجیب ہے، لہٰذا خدا تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ چاہے جانے اور محبت کیے جانے کے قابل کوئی ہے تو وہ آپ ہی کی ہستی ہے۔

جمال محمدی ﷺ:

چنانچہ حسن و جمال کے لحاظ سے آپ کی کوئی مثال نہیں ہے، عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت سیدنا یوسف علیہ السلام دنیا میں سب سے زیادہ حسین تھے، مگر یہ اپنی جگہ صحیح ہے، مگر اس عموم میں حضرت رسالت پناہ ﷺ داخل نہیں ہیں۔ حضرت یوسفؑ دنیا کے تمام حسینوں میں سب سے زیادہ حسین تھے اور تمام جمیلوں میں سے زیادہ صاحب جمال تھے، مگر حضرت محمد ﷺ سے زیادہ نہیں، کیوں کہ آپ کا حسن و جمال، حضرت یوسفؑ سے بھی بڑھا ہوا تھا۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ کیا رسول اللہ ﷺ کا چہرہ تلوار کی مانند چمک دار تھا؟ تو حضرت براء نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ آپ کا چہرۂ انور تو چاند کی طرح تھا۔ (شمائل ترمذی:۲، مشکوۃ:۵۱۵)

ایک صحابی حضرت کعب بن مالک فرماتے ہیں کہ جب آپ خوش ہوتے تو آپ کا چہرہ چمک اٹھتا، گویا کہ چاند کا ٹکڑا ہے اور یہ بات ہم سب جانتے تھے۔ (مشکوۃ:۵۱۷)

حضرت ربیع بنت معوذ بن عفراء نے فرمایا کہ اگر تم حضور ﷺ کو دیکھتے تو گویا تم سورج کو دیکھتے۔ (مشکوۃ:۵۱۷)

حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ چاندنی رات میں میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، پس کبھی میں آپ کی طرف نظر کرتا اور کبھی چاند کو دیکھتا، اس وقت آپ کے جسم مبارک پر سرخ چادر تھی، پس آپ چاند سے بھی زیادہ حسین تھے۔ (شمائل ترمذی:۲)

حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ حسین کسی چیز کو نہیں دیکھا، گویا کہ سورج آپ کے چہرۂ انور میں چل رہا ہے۔ (مشکوۃ ۵۱۸)

حضرت عائشہ وحضرت حسان کے اشعار:

حضرت عائشہ صدیقہؓ کے دو شعر آپ کے حسن و جمال کی تعریف میں بڑے عجیب ہیں، وہ کہتی ہیں:

فَلَوْ سَمِعُوْا فِيْ مِصْرَ أَوْصَافَ خَدِّهٖ
لَمَا بَذَلُوْا فِيْ سَوْمِ يُوْسُفَ مِنْ نَقْدٖ
لَوَاحِيْ زُلَيْخَا لَوْ رَأَيْنَ جَبِيْنَهٗ
لَآثَرْنَ بِالْقَطْعِ الْقُلُوْبَ عَلَى الْأَيْدٖ

جس کا خلاصۂ مضمون یہ ہے کہ اگر مصر والے نبی کریم ﷺ کے رخ انور کے اوصاف سن لیتے تو حضرت یوسف کے سودے میں کچھ نقد مال نہ لگاتے، اور اگر زلیخا کی سہیلیاں آپ کی جبین کو دیکھ لیتیں تو ہاتھ کے بجائے اپنے دلوں کو چاک کر ڈالتیں۔

اور شاعر رسول حضرت حسانؓ کے اشعار ہیں:

وَأَحْسَنَ مِنْكَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَيْنِيْ

وَأَجۡمَلَ مِنۡكَ لَمۡ تَلِدِ النِّسَاءُ
خُلِقۡتَ مُبَرَّأً مِّنۡ كُلِّ عَيۡبٍ
كَأَنَّكَ خُلِقۡتَ كَمَا تَشَاءُ

(یعنی آپ سے زیادہ حسین میری آنکھ نے قطعاً نہیں دیکھا، اور آپ سے زیادہ جمیل عورتوں نے نہیں جنا، آپ ہر عیب سے پاک پیدا کئے گئے ہیں، گویا آپ ایسے پیدا ہوئے ہیں جیسے خود آپ نے چاہا ہو)

جمال نبویؐ پر مزید روایات:

یہ تو آپ کے چہرۂ انور کے جمال کا حال ہے، اس کے علاوہ ایک صحابی حضرت سراقہؓ فرماتے ہیں کہ میں آپ کی پنڈلی دیکھنے لگا گویا کہ وہ انگارہ ہے (یعنی سرخ ہے) اور مہرش الکعبیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کی پیٹھ دیکھی گویا کہ وہ چاندی کی تختی ہے۔(فتح الباری:۶/۵۷۰)

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بالکل گورے رنگ کے تھے اور آپ کا پسینہ موتی معلوم ہوتا تھا اور فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی دیباج اور ریشم کا کپڑا ابھی ایسا نہیں چھوا جو رسول اللہ ﷺ کی ہتھیلی سے زیادہ نرم ہو اور نہ کوئی مشک اور عنبر ایسا سونگھا جو نبی کریم ﷺ کی خوشبو سے زیادہ خوشبودار ہو۔(مشکوۃ:۵۱۷)

حضرت ام سلیمؓ رسول اللہ ﷺ کا پسینہ جمع فرماتیں اور اسے عطر میں ملا دیتیں جب حضور ﷺ نے دریافت کیا کہ یہ کیا ہے؟ فرمایا کہ یہ آپ کا پسینہ ہے، ہم ہمارے عطر میں اس کو ڈال لیتے ہیں اور وہ سب سے زیادہ عمدہ عطر ہوتا ہے۔ (مشکوۃ:۵۱۷)

حضرت انسؓ کی جب وفات ہونے لگی تو وصیت فرمائی کہ اس عطر میں سے ان کو بھی لگایا جائے۔ (مرقات: ۱۱/۷۹)

حضرت جابر بن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے میرے گال پر اپنا ہاتھ پھیرا تو میں نے اس کی ٹھنڈک اور خوشبو محسوس کی گویا کہ وہ ابھی ابھی عطار کی شیشی میں ڈال کر نکالا گیا ہو۔ (مشکوۃ: ۵۱۷)

میں نے بطور نمونہ چند احادیث کے حوالے پیش کئے ہیں جن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کے حسن و جمال کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔

حضرات علماء کے ارشادات:

علامہ مناویؒ اور ملا علی قاری نے علامہ قرطبیؒ کا یہ روح افزا قول نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا پورا حسن و جمال دنیا میں ظاہر نہیں ہوا، ورنہ آپ کو دیکھنے کی آنکھوں میں طاقت نہ ہوتی۔ (جمع الوسائل: ۱/۹ وشرح شمائل للمناوی علی حامش جمع الواسل: ۱/۱۸)

حضرت شیخ زکریا صاحب کاندھلویؒ شمائل ترمذی کی شرح میں لکھتے ہیں کہ

''مناویؒ نے لکھا ہے کہ ہر شخص یہ اعتقاد رکھنے کا مکلّف ہے کہ حضور ﷺ کا جسم مبارک جن اوصاف جمیلہ کے ساتھ متصف ہے کوئی دوسرا ان اوصاف میں حضور ﷺ جیسا نہیں ہوسکتا اور یہ محض اعتقادی چیز نہیں، سیر و تاریخ و احادیث کی کتابیں اس سے لبریز ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ نے کمالات باطنیہ کے ساتھ جمال ظاہری بھی علی وجہ الاتم عطاء فرمایا تھا''۔ (خصائل نبوی: ۱۶)

بھائیو! غور کرو، کہ جب آپ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ جسمانی لحاظ سے بھی کوئی آپ کا ثانی نہیں، آپ بے نظیر و بے مثال ہیں تو آپ کے باطنی کمالات کے بارے میں کیا خیال ہے؟

کمال محمدی ﷺ:

یہ تو جمال کا ذکر تھا، اب لیجئے آپ کا کمال، آپ علیہ السلام کے کمال کی طرف نظر کیجئے تو وہ بھی بے مثال اور بے نظیر ہے، کمال علمی کو لیجئے تو وہ عروج کی انتہائی منزلوں پر پہنچا ہوا ہے۔ سب مخلوقات میں آپ کو اللہ تعالی نے سب سے زیادہ علم عطاء فرمایا تھا، اور علم غیب میں سے اللہ نے آپ کو بہت سی باتوں پر مطلع کیا، اس قدر امور پر کہ کسی اور کو اس قدر باتوں پر مطلع نہیں کیا گیا۔

امام بوصریؒ نے قصیدۂ بردہ میں فرمایا کہ:

فَإِنَّ مِنْ جُودِكَ الدُّنْيَا وَ ضَرَّتَهَا
وَ مِنْ عُلُومِكَ عِلْمُ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ

(آپ ہی کی سخاوت سے یہ دنیا اور آخرت ہے اور آپ کے علوم سے لوح و قلم کا علم ہے)

اور یہ کمال علمی دلیل ہے آپ کے کمال عقلی کا، کیوں کہ علمی کمال بغیر کمال عقل کے ممکن نہیں۔

آپ کے کمال عقلی کا ایک واقعہ:

آپ کا کمال عقلی اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ جب قریش مکہ نے کعبۃ اللہ کی عبارت کو از سر نو تعمیر کیا اور اس وقت حجر اسود کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا گیا تھا، تو تعمیر کے بعد قریش کے قبائل نے اس بارے میں اختلاف کیا کہ حجر اسود کو کون اپنی جگہ نصب کرے؟ ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ یہ فضیلت اس کو ملے، یہاں تک نوبت پہنچی کہ لوگ اپنی بہادری اور جرأت مندی کا مظاہرہ کرنے کے لیے عربوں کے دستور و

رواج کے مطابق پیالوں میں خون بھر کر اس میں ہاتھ ڈال کر کہنے لگے کہ یہ فضیلت ہم حاصل کریں گے۔

اس میں اشارہ تھا کہ ہم جنگ کے لیے بھی تیار ہیں۔ایک تجربہ کار بوڑھے نے مشورہ دیا کہ ایسا کرو کہ کل صبح جو آدمی سب سے پہلے کعبۃ اللہ میں داخل ہو، اسی کو اس کا اہل سمجھا جائے کہ وہ کعبۃ اللہ میں حجر اسود نصب کرے۔ اس پر سب کا اتفاق ہو گیا، جب صبح ہوئی تو سب سے پہلے اس میں داخل ہونے والے وہ ہمارے اور آپ کے آقا حضرت سرکارِ مدینہ ﷺ تھے۔ جب قریش نے آپ کو دیکھا تو خوش ہو گئے، اور آپ سے کعبۃ اللہ میں حجر اسود نصب کرنے کے لیے کہا، مگر آپ نے اپنی کمال عقلی کا مظاہرہ فرماتے ہوئے عجیب تدبیر پیش فرمائی، آپ نے فرمایا کہ ایک چادر بچھا دو، جب چادر ڈال دی گئی تو آپ نے اپنے دست مبارک سے حجر اسود کو اٹھا کر اس میں رکھا، پھر تمام سرداران قریش سے فرمایا کہ سب اس چادر کو پکڑ کر چلیں، جب چلے تو کعبۃ اللہ کے پاس آپ نے رکوا کر اپنے دست مبارک سے حجر اسود کو نصب کر دیا، خود بھی اس فضیلت سے مشرف ہوئے اور سب کو بھی شامل کر لیا اور ایک بڑی جنگ سے لوگوں کو بچا لیا۔ یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا ہے۔(دیکھو سیرت ابن ہشام:۱/۱۹۷)

اسی طرح آپ کو ایک کمال فصاحت لسانی کا عطا فرمایا گیا تھا اور اس میں بھی آپ بے نظیر تھے، حتی کہ حضرات صحابہ کرام کو بعض وقت آپ کی گفتگو سمجھنے میں دقت پیش آتی اور وہ آپ کی انتہائی فصیح و بلیغ زبان جو انتہائی کمال عروج کو پہنچی ہوئی تھی، سمجھ نہ سکتے، اس لیے بسا اوقات آپ کو بات دہرانی پڑتی۔

حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ آپ سے عرض کیا کہ آپ ہم میں ہی رہے، پھر بھی

آپ ہم میں سب سے زیادہ فصیح ہیں، یہ کیسے؟ آپ نے فرمایا کہ حضرت اسماعیل کی زبان کی فصاحت مٹ گئی تھی، حضرت جبرئیل اس کو لے کر میرے پاس آئے اور میں نے اس کو یاد کیا۔

اور ایک روایت میں ہے کہ آپ سے حضرات صحابہ نے عرض کیا کہ آپ اور ہم ایک ہی خاندان کے ہیں اور ایک ہی شہر میں زندگی کر رہے ہیں مگر آپ ایسا کلام کرتے ہیں کہ ہم سمجھ نہیں پاتے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ادب کی تعلیم دی ہے اور بہترین تعلیم دی ہے۔ (جمع الوسائل: ۸/۲)

اور ایک کمال آپ کا اخلاقی کمال ہے، کمال اخلاق کا یہ عالم کہ جو آپ کو دیکھتا اور آپ کے اخلاق کو دیکھتا وہ آپ کا گرویدہ ہو جاتا، حضرت انس بن مالکؓ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ عمدہ اخلاق والے تھے۔ (شمائل ترمذی: ۲۳)

غرض یہ کہ کسی طرح کا بھی کمال ہو وہ آپ میں علی وجہ الاتم والاکمل پایا جاتا ہے، اسی لیے علامہ مناوی فرماتے ہیں کہ علماء نے تصریح کی ہے کہ کمال ایمان یہ ہے کہ یہ عقیدہ رکھا جائے کہ کوئی شخص نبی کریم ﷺ سے زیادہ صاحب کمال نہیں اور نہ کوئی ایسا ہے جو آپ کے برابر صاحب کمال ہو۔ (شرح شمائل علی حامش جمع الوسائل: ۱۸/۱)

ایسے صاحبِ کمال کے بارے میں کیا خیال ہے جب کہ معمولی سے معمولی کمال بھی باعثِ محبت ہوا کرتا ہے تو آپ سے محبت وعشق بھی سب سے زیادہ لازم وضروری ہوئی۔

عطاونوالِ محمدی ﷺ:

محبت کا تیسرا سبب عطاونوال بھی آپ کے اندر علی وجہ الکمال پایا جاتا ہے، آپ

نے ظاہری و باطنی مادی وروحانی عطیہ جات اتنے دیئے ہیں کہ ان کا شمار کرنا دشوار ہے۔حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ آپ "اَجوَدُالنَّاسِ" (یعنی لوگوں میں سب سے زیادہ سخی تھے۔(مشکوۃ:۵۱۷،شمائل ترمذی:۱)

اورایک روایت میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جس چیز کا بھی سوال کیا گیا،آپ نے "نہیں" نہیں فرمایا۔(فتح الباری:۱/۱۳۱)

اور جو آپ نے ایمان،اسلام،دین کے احکام،وحی وقرآن،عمدہ اخلاق و نیک اعمال کے ہدایا امت کوعطا فرمائے ہیں،یہ باطنی وروحانی عطیہ جات ہیں،اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام بوصریؒ نے قصیدۂ بردہ میں فرمایا کہ

فَإِنَّ مِنْ جُودِكَ الدُّنيَا وَ ضَرَّتِهَا
وَ مِنْ عُلُومِكَ عِلْمُ اللَّوحِ وَالْقَلَمِ

(آپ ہی کی سخاوت سے یہ دنیا اور آخرت ہے اور آپ کے علوم سے لوح وقلم کا علم ہے)۔

غرض آپ نے ہمیں دین ودنیا میں سے بہت کچھ عطا فرمایا تو آپ سے محبت نہ ہوتو پھر کس سے ہو؟اس طرح آپ کی ذات اطہر میں تمام اسبابِ محبت جمع ہیں،اس لیے آپ سب سے زیادہ محبت کیے جانے کے مستحق ہیں۔

عشقِ نبوی کے آثار:

مگر یاد رہے کہ ایک ہے محبت اور ایک ہے دعویٔ محبت،دعویٔ محبت سے محبت کا ثبوت نہیں ہوجاتا،جب تک کہ اس کی دلیل یا کم از کم اس کی علامت نہ پائی جائے اور چوں کہ آج کل عشقِ رسول ومحبت رسول کے مدعی بے شمار ہیں اور بعض غرض

پرست ومفاد پرست لوگ عشقِ رسول کے دعویٰ سے عوام الناس کو دھوکہ اور فریب میں مبتلا کرنے اور اپنے مفادات واغراض کے حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ عشقِ نبوی کے علامات وآثار کا ذکر کیا جائے، تاکہ لوگ محبت ودعویٔ محبت میں فرق جان لیں اور ہر مدعی کے پیچھے پڑکر گمراہی وضلالت کا شکار نہ ہو جائیں۔

علماء نے لکھا ہے کہ دعویٔ محبت میں وہی سچا ہے جو محبت کی علامتیں بھی اپنے اندر رکھتا ہو۔ حضرت قاضی عیاضؒ شفاء میں فرماتے ہیں:

’’جو کسی چیز سے محبت کرتا ہے وہ اس کو ترجیح دیتا ہے اور اس سے موافقت کرتا ہے، ورنہ وہ اپنی محبت میں سچا نہیں ہو سکتا، بلکہ محض مدعی ہوگا۔ (شفاء:۲/۲۲)

۞ اتباعِ سنت وشریعت:

یہاں چند اہم اہم علامتوں کا ذکر کرتا ہوں، تاکہ بات پوری طرح سامنے آجائے، لیجئے سنئے کہ عشق رسول کی ایک اہم اور بڑی علامت یہ ہے کہ اتباع سنت وشریعت کا اہتمام ہو، جو شخص جس قدر شریعت کا اتباع کرتا ہے اور سنت کی پیروی کرتا ہے، سمجھا جائے گا کہ اسی قدر محبتِ نبوی وعشق نبوی اس کے دل کے اندر ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت انسؓ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ’’بیٹا! اگر تو ایسا کر سکے کہ کسی سے دل میں کوئی کینہ نہ ہو تو ایسا کرنا، یہ میری سنت ہے اور جس نے میری سنت (پر عمل کرکے اس کو) زندہ کیا اس نے مجھ سے محبت رکھی اور جو میرے سے محبت رکھتا ہے وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ (الشفاء:۲/۲۲)

معلوم ہوا کہ محبت وعشق رسول کے لیے اتباع شریعت واتباع سنت لازم و

ضروری ہے، اگراس کے بغیر کوئی دعویٔ محبت کرتا ہےتو وہ صحیح نہیں ہے۔

معرفت وطریقت کے نام پر دھوکہ:

آج ایک طبقہ معرفت وطریقت اور عشق ومحبت کے نام پر خلاف شرع وخلاف سنت بہت سی باتوں کو اختیار کیے ہوئے ہے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ یہ شریعت وسنت کے خلاف ہےتو کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ معرفت وطریقت کی باتیں ہیں ،جن کوشریعت والے سمجھ نہیں سکتے،حالانکہ یہ سراسرگمراہی ہے ،جوطریقت ومعرفت شریعت کے موافق نہیں،اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

حضرت پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ یادرکھ کہ جس حقیقت وطریقت کی شریعت تائید وتوثیق نہ کرے اوراسے جائز نہ ٹھہرائے وہ صریحاً کفر والحاد ہے۔(فتوح الغیب:۱۰۹،مقالہ:۴۰)

حضرت شیخ جیلانیؒ کے ہمعصر دوسرے بزرگ حضرت احمد کبیر رفاعیؒ ایک جگہ فرماتے ہیں:

طریقت شریعت کا عین ہے، مگربعض لوگ اولیاء اللہ پرتہمت لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ طریقت الگ ہےاورشریعت الگ ہے۔(رموزِ رفاعیہ:۳)

غرض یہ کہ جب تک شریعت کا اتباع نہ ہواورسنتوں کی پیروی نہ ہو وہ اپنے دعویٔ محبت میں سچانہیں ہوسکتا،اگرچہ وہ کچھ عجیب کرتب دکھائے اورحیرت انگیز افعال اس سے سرزد ہوں،مگران باتوں سے دھوکہ ہرگز نہ کھانا چاہئے۔

ذکرنبوی:

آپ سے محبت کی ایک علامت یہ ہے کہ آپ کا ذکر مبارک کرتا رہے؛ کیوں کہ جوکسی سے محبت کرتا ہےوہ اس کا ذکر زیادہ سے زیادہ کرتا ہے۔

حضرات صحابہ کرام جب بیٹھتے تو آپ کا ذکر کیا کرتے ،آپ کے افعال و اعمال، آپ کے خصائل وشمائل کا تذکرہ فرماتے ،مگر یاد رہے کہ یہاں ذکر سے مراد آپ کے نام کی تسبیح پڑھنا نہیں ہے ، بلکہ مراد یہ ہے کہ جیسے کوئی اپنے شیخ وپیر یا استاذ و باپ کا تذکرہ کرتا ہے، اس طرح آپ کا ذکر ہو،آپ کے واقعات وحالات ،آپ کی سیرت و سنت، آپ کے حسن و جمال، آپ کے فضل وکمال کا ذکر کیا جائے ،خواہ وہ کسی جگہ بھی ہو، یہ آپ سے محبت کی علامت ہے۔

میلا د کر لینا کافی نہیں:

بعض لوگ جو میلا د کا جلسہ کر کے خوش ہو جاتے ہیں کہ ہم نے اللہ کے نبی کا حق ادا کر دیا، یہ کافی نہیں بلکہ دن رات آپ کا ذکر ہونا چاہئے ،کوئی مجلس اس سے خالی نہ ہو جائے ،اور تمام معاملات وحالات میں آپ کو یاد رکھنا چاہئے ،اسی لیے حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی فرماتے تھے کہ لوگ سال میں ایک دفعہ میلا د کرتے ہیں اور ہمارے یہاں تو الحمدللہ روزانہ میلا د ہوتا ہے۔

کیا مطلب؟ مطلب یہ ہے کہ ہم ہر وقت اللہ کے نبی ﷺ کو یاد کرتے ہیں اور ہر لمحہ آپ کا ذکر خیر کرتے ہیں،اور میلا د والے سال میں ایک بار میلا د کا جلسہ کرنے کے بعد کبھی بھول کر بھی آپ کا ذکر نہیں کرتے ۔کیا یہی آپ کا حق ہے،اور کیا آپ اس سے خوش ہو جائیں گے؟

مشابہت نبوی ﷺ:

محبت کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ آپ کے ساتھ ہر چیز میں مشابہت پیدا کرنے کی کوشش کرے،صورت میں، سیرت میں، چال چلن میں ، ہنسنے

اور بولنے میں، کھانے پینے میں، لباس و پوشاک میں۔

حضرت ابن عمرؓ چمڑے کی جوتیاں پہنتے تھے اور پیلے رنگ سے رنگتے تھے؛ کیوں کہ نبی کریم ﷺ بھی ایسا کرتے تھے۔(شفاء:۲/۲۴)

حضرت انسؓ نے جب آپ کو دیکھا کہ آپ کدو پسند کرتے ہیں تو وہ بھی کدو کو پسند کرنے لگے۔(شمائل ترمذی:۱۰)

حضرت حسن بن علی، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہم ایک دفعہ حضرت سلمہؓ کے پاس آئے اور کہا کہ ہمیں وہ کھانا پکا کر دیجئے جو نبی کریم ﷺ کو پسند تھا۔(شمائل ترمذی:۱۱)

حضرت ابن عمر کا کمال اتباع:

حضرت ابن سیرین بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ نے ایک دفعہ حج کیا، اور حج کے بعد واپسی ہم لوگ ساتھ تھے، آپ اونٹ پر سوار ہوئے اور چلتے رہے اور ہم بھی ساتھ چلتے رہے، درمیان راستے میں ایک جگہ اونٹ والے سے کہا کہ اونٹ کو بٹھادو، اس نے اونٹ کو بٹھا دیا، آپ اترے اور ذرا دور چلے گئے، پھر ایک جگہ اس طرح بیٹھ گئے جیسے کوئی پیشاب کرنے بیٹھتا ہے، اس کے بعد واپس آئے اور فرمایا کہ چلو۔ حضرت ابن سیرین نے کہا کہ حضرت ہم تو یہ سوچ رہے تھے کہ آپ نے پیشاب کیا ہے تو وضو بھی کریں گے اور دو چار رکعتیں پڑھیں گے؟ فرمایا کہ میں نے تو پیشاب نہیں کیا، میرا تو وضو ہے، اس پر لوگوں کو اور تعجب ہوا، تو عرض کیا کہ حضرت! آپ نے تو ابھی ادھر جا کر پیشاب کیا تھا؟ کہا کہ نہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ میں ایک دفعہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ اسی راستے پر تھا سے گزر رہا تھا، تو آپ اکو پیشاب کی ضرورت ہوئی اور آپ نے اسی جگہ پیشاب فرمایا تھا، جہاں میں جا کر بیٹھا تھا، مجھے

اس وقت پیشاب تو نہیں آیا، مگر میں نے سوچا کہ آپ کی اس میں بھی اتباع کروں، لہٰذا مشابہت نبوی کے لئے صرف وہاں جا کر بیٹھ کر آ گیا۔ (مفتاح الجنۃ للسیوطی:۳۹۔۴۰)

یہ ہے محبت کا کرشمہ اور اس کو عشق کہتے ہیں کہ اتباع و مشابہت نبوی کامل طور پر ہو، اور ہر ہر چیز میں ہو۔

خلاصہ کلام:

غرض یہ کہ دعویٔ محبت کافی نہیں، بلکہ ان علامات کے ذریعہ ثبوت دینا بھی ضروری ہے۔ آج دعوئ محبت کرنے والے، ایسے ہیں کہ جو بدعات وخرافات اور جاہلی رسومات اور من مانی محدثات سے اپنی زندگی کو آراستہ کرتے اور سنتوں اور شرعی احکام سے بغاوت کرتے ہیں اور سنت وتوحید کا نام لینے والوں کے دشمن ہو جاتے اور ان کو بدنام کرنے کی سازش وکوشش کرتے ہیں، جو تحریکیں اور جماعتیں دین کی خدمت ونصرت، حمایت واشاعت، تبلیغ ودعوت کا کام کرتی ہیں، جیسے تبلیغی جماعت، اور دیوبندی مکتبِ فکر کے علماء ان کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

لہٰذا عوام کو چوکنا رہنا چاہئے اور محض دعوی محبت سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ عاشق ہو گیا ہے، جب کہ وہ دین وشریعت پر نہیں چلتا اور دینی وتبلیغی کام کو بھی نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو نبی کریم ﷺ کی سچی محبت عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

باسمہ تعالیٰ

محبت وخشیت کے آنسو

اللہ تبارک وتعالی کی محبت یا خشیت سے رونا ایک عظیم عبادت اور مقدس عمل ہے، اور جس کے دل میں اللہ تعالی کی محبت پیدا ہو جاتی ہے اسے یہ دولت نصیب ہوتی ہے، پھر اس رونے پر آنکھوں سے نکلنے والے آنسوں بھی مقدس اور قابل قدر ہو جاتے ہیں۔

محبت الہیہ میں رونے کی فضیلت:

اللہ کی محبت میں رونے کی فضیلت اس حدیث میں آئی ہے، جس میں سات قسم کے لوگوں کو قیامت کے دن اللہ تعالی کے عرش کے سایہ میں جگہ ملنے کی بشارت سنائی گئی ہے، ان سات خوش قسمت لوگوں میں ایک وہ ہے جس کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا گیا:

”رجل ذکر اللّٰہ خالیاً ففاضت عیناہ“(وہ آدمی جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور اسکی آنکھیں بہہ گئیں)۔(بخاری:۶۲۹)

اس حدیث میں خدا کو یاد کر کے رونے کا ذکر ہے۔علامہ قرطبی نے فرمایا کہ رونا ذاکر کے حال اور اس کو جو مکشوف ہوتا ہے اس کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ جلال خداوندی اگر مکشوف ہوا تو رونا اللہ کی خشیت وخوف سے ہوگا اور اگر اوصاف جمال کا مشاہدہ ہوا تو رونا، محبت وشوق کی وجہ سے ہوگا۔(فتح الباری:۲/۱۴۷،عمدۃ القاری :۵/۱۷۹)

اس سے معلوم ہوا کہ خدا کے اوصاف جمال کے مکشوف ہونے پر اللہ کی محبت اور اسکے شوق دیدار میں رونا بڑا بھاری عمل اور مقدس عبادت ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ:

مولانا رومی نے اپنی مثنوی میں ذکر کیا ہے کہ ایک بزرگ اللہ کی محبت میں رویا کرتے تھے اور شوق دیدار انکو بے چین و مضطرب کئے ہوئے تھا، ان کے ایک رفیق طریق نے ان کو نصیحت کی اور کہا کہ اتنا نہ رویا کرو، ورنہ کہیں آنکھوں مین خلل و خرابی نہ آجائے۔

مولانا رومیؒ اس کو نقل کرتے ہیں:

زاہدے را گفت یارے در عمل   کم گری تا چشم را نیاید خلل

اس پر زاہد و عابد و عاشق نے جواب دیا کہ دیکھو بھائی! دو حال سے خالی نہیں یا تو اس رونے اور گریہ وزاری کی وجہ سے آخرت میں جمال خداوندی مجھے نصیب ہوگا یا یہ کہ ان آنکھوں کو یہ دولت نصیب نہ ہوگی، اگر رونے سے جمال خداوندی نصیب ہوجاتا ہے تو ان آنکھوں کے نہ رہنے اور خراب ہوجانے کا کیا غم؟ اللہ کے وصال و دیدارِ جمال کیلئے دو آنکھیں کیا، لاکھوں آنکھوں کو بھی قربان کیا جاسکتا ہے اور اگر خدانخواستہ میری بد بخت آنکھوں کو جمال حق کا دیکھنا نصیب نہ ہوا تو ان بد بخت آنکھوں کا پھوٹ جانا ہی بہتر ہے، وہ آنکھ ہی کیا جو جمال یار کے دیکھنے کے قابل نہ ہو۔

مولانا رومیؒ زاہد کا یہ جواب نقل کرتے ہیں:

گفت زاہد از دو بیروں نیست حال ☆ چشم بیند یا نہ بیند آں جمال
گر بہ بیند نورِ حق خود چہ غم است ☆ در وصال حق دو دیدہ کم است

و ر نہ بیند نو رحق را گو بر و ! ☆ ایں چنیں چشم شقی گو کو رشو

ایک عاشقِ خدا کا گریہ و بکا:

امام غزالیؒ نے مکاشفۃ القلوب میں حکایت لکھی ہے کہ حضرت ذوالنون مصریؒ کہتے ہیں کہ ایک دن میں خانہ کعبہ میں داخل ہوا تو ستون کے قریب ایک برہنہ نوجوان مریض کو پڑے دیکھا جس کے دل سے رونے کی آواز نکل رہی ہے، میں نے اس کے قریب جا کر اسے سلام کیا اور پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا کہ میں ایک غریب الوطن عاشق ہوں، میں اسکی بات سمجھ گیا اور میں نے کہا کہ میں بھی تیری طرح ہوں، وہ رونے لگا، اسکا رونا دیکھ کر مجھے بھی رونا آ گیا، اس نے مجھے دیکھ کر کہا کہ تم کیوں رو رہے ہو؟ میں نے کہا کہ اسلئے رو رہا ہوں کہ تیرا اور میرا مرض و بیماری ایک ہے، اس نے چیخ ماری اور اسکی روح پرواز کر گئی۔

یہ ہے خدا کی محبت اور عشق کا رونا جس پر وعدہ ہے کہ خدا تعالی ایسے شخص کو قیامت کے دن اپنے سائے میں جگہ دیگا۔

خوف خدا سے رونے کی فضیلت:

اور خوف وخشیت سے رونا بھی فضیلت والا عمل ہے۔ چنانچہ حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ.

" لَيۡسَ شَیۡءٌ اَحَبَّ اِلَی اللّٰہِ مِنۡ قَطۡرَتَيۡنِ : قَطۡرَۃِ دُمُوۡعٍ مِنۡ خَشۡيَۃِ اللّٰہِ وَقَطۡرَۃِ دَمٍ يُھۡرَاقُ فِیۡ سَبِيۡلِ اللّٰہِ". (اللہ کے نزدیک کوئی شی دو قطروں سے زیادہ پیاری نہیں، ایک آنسو کا قطرہ جو اللہ کے خوف وڈر سے نکلے اور دوسرے خون کا قطرہ جو اللہ کے راستے میں بہایا جائے)۔(ترمذی. مشکوۃ:۳۳۳)

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ''کوئی مؤمن بندہ ایسا نہیں کہ اسکی آنکھوں سے خوف خدا کی وجہ سے آنسو نکلے، اگر چہ وہ مکھی کے سر کے برابر ہی (چھوٹا) کیوں نہ ہو، پھراس آنسو سے اسکے چہرہ پر کچھ حصہ لگ جائے، مگر اللہ اسکو دوزخ پرحرام کردیتے ہیں۔ (مشکوۃ:۴۵۸)

مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے خوف وڈر سے جو آنسو نکلتا ہے وہ اللہ کی نظر میں اس قدر قیمتی ہوتا ہے کہ اسکا کوئی بھی حصہ اگر چہرہ پر لگ جائے تو وہ چہرہ بھی قیمتی ومبارک ہوجاتا ہے اور اللہ تعالی اس پر دوزخ کوحرام کردیتے ہیں، یادرہے کہ مراد چہرہ سے مؤمن کی ذات ہے کہ اس آنسو کی وجہ سے اسکی ذات کو دوزخ پرحرام کردیا جاتا ہے۔

ایک عجیب نکتہ:

اس حدیث میں یہ نہیں فرمایا کہ '' حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ النَّارَ'' (کہ اللہ اس مؤمن پر دوزخ کوحرام کردیتا ہے) بلکہ یہ فرمایا کہ '' حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ'' (کہ اس مؤمن کو دوزخ پرحرام کردیتا ہے) مؤمن پر دوزخ کے حرام ہونے اور دوزخ پر مؤمن کے حرام ہونے میں بڑا فرق ہے۔مؤمن پر دوزخ کے حرام ہونے کا مطلب تو یہ ہے کہ مؤمن دوزخ میں نہ جائیگا، کیونکہ اس پر دوزخ حرام کردی گئی ہے، اور دوزخ پر مؤمن کے حرام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مؤمن اگر دوزخ میں کسی وجہ سے ڈال بھی دیا جائے، تب بھی دوزخ پرحرام ہے کہ وہ اسکو جلائے یا اذیت پہنچائے۔

لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سے ڈر کر رونے والے مؤمن کو دوزخ میں نہ ڈالا جائیگا، لیکن اگر بفرض محال یا کسی وجہ سے ایسا مؤمن دوزخ میں ڈال بھی دیا

جائے، تب بھی اسکو دوزخ نہ جلائے گی۔

شاہ عبدالغنیؒ کا واقعہ:

معلوم ہوا کہ یہ خوفِ خدا کے آنسو کا قطرہ بہت ہی قیمتی دولت ہے اور اس کو چہرہ پر مل لینا چاہیے، حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ جو حضرت تھانویؒ کے خلیفہ گذرے ہیں، ان کے بارے میں پڑھا ہے کہ وہ روتے وگڑگڑاتے اور جو آنسو کے قطرے نکلتے ان کو اپنے چہرہ پر مل لیتے تھے۔

بعض لوگ رومال سے ان آنسوؤں کو پوچھ لیتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ ایسا کرنے کے بجائے ان قطروں کو منہ پر، ہاتھ پر یا اور کسی عضو پر مل لینا چاہیے تاکہ ان قطرات سے جہنم کی آگ پر یہ اعضاء حرام ہو جائیں۔

ایک عجیب وحیرت زا واقعہ:

بعض علماء سے یہ واقعہ جو بڑا عجیب وحیرت زا ہے سنا گیا کہ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کے دور میں ایک شخص مسافر کہیں جارہا تھا، راستہ میں کسی شخص کو نزع کے عالم میں دیکھا اور مرنے کے بعد اس کی تجہیز وتکفین میں شریک رہا اور خود قبر میں اُتر کر اسکو قبر میں رکھا، اس کے بعد اس کو اندازہ ہوا کہ اس کے جیب سے روپیوں کی تھیلی غائب ومفقود ہے۔ خیال ہوا کہ شاید تدفین کے وقت قبر میں گرگئی ہوگی، اس لئے قبر کو کھودنے کا ارادہ کیا اور کھودنا شروع کیا، تو دیکھتا کیا ہے کہ قبر آگ کے شعلے بھڑکا رہی ہے اور اس آگ کا اس کے ہاتھ پر بھی اثر ہوا، جس کی وجہ سے اس کے ہاتھ میں بے انتہاء سوزش وجلن پیدا ہوگئی جو نا قابل برداشت وتحمل تھی، اس نے اس کا علاج بھی کرایا، مگر تمام اطباء وحکماء اور ڈاکٹر عاجز آگئے، کسی کا علاج کارگر نہ

ہوا، ایک زمانہ اسی بے قراری و بے چینی واضطراب و پریشانی میں گذر گیا، کسی نے اسکومشورہ دیا کہ تم دہلی جاؤ وہاں اس زمانہ کے سب سے بڑے عالم و بزرگ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز دہلویؒ ہیں، ان سے دعاء کراؤ، وہ شخص اس مشورہ پر دہلی حضرت کی خدمت میں گیا اور سارا واقعہ سنایا، اس پر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے فرمایا کہ قبر میں جس آگ سے تیرا ہاتھ جلا ہے وہ دنیا کی آگ نہیں، بلکہ آخرت کی اور جہنم کی آگ ہے، جہنم کی آگ کا علاج دنیا کی دوائیاں اور دنیا کے حکیم وڈاکٹر نہیں کر سکتے ،اس آگ کا علاج صرف ایک ہے، وہ یہ کہ اللہ سے اپنے گناہوں پر استغفار کراور اس کے سامنے خوب گڑگڑا کر رو ،اور آنکھوں سے جو آنسوں نکلیں وہ اپنے اس جلے ہوئے ہاتھ پر لگا، کیونکہ حدیث میں ہے کہ جہنم کی آگ خدا کے خوف سے رونے سے بجھ سکتی ہے۔

چنانچہ اس آدمی نے ایسا ہی کیا تو دیکھا کہ وہ سوزش اور جلن ختم ہوگئی، معلوم ہوا کہ یہ آنسو کے قطرے بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔

خوفِ خدا سے رونے کے واقعات:

خوف خدا سے رونے والے حضرات کے واقعات ہمارے لئے بڑے عبرت خیز بھی ہیں، اور دلوں کو نرم کرنے والے بھی ہیں، اس لئے کبھی کبھی ان کے اس طرح کے حالات سننا بھی چاہئے۔

ایک بار خلیفہ عبدالملک بن مروان نے ایک شخص کو دیکھا جس نے بہت لمبا سجدہ کیا، جب اس نے سر اُٹھایا تو اس کے سجدے کی جگہ آنسوؤں کی وجہ سے بھیگی ہوئی تھی، خلیفہ نے ایک آدمی کو وہاں نگرانی کرنے کھڑا کر دیا اور کہا کہ جب یہ فارغ ہو جائے تو میرے پاس لانا، تا کہ اس کی عقل کا امتحان کروں۔ الغرض جب وہ نماز

سے فارغ ہوا تو بادشاہ کے سامنے لایا گیا، بادشاہ نے کہا کہ میں نے تجھ سے ایک ایسی بات دیکھی ہے کہ جنت تو اس کے بغیر بھی مل سکتی ہے (یعنی اتنا رونے کی کیا ضرورت ہے جب کہ اس کے بغیر بھی جنت مل سکتی ہے)۔اس شخص نے ایک زور کی چیخ ماری جس سے بادشاہ بھی خوف زدہ ہو گیا، پھر وہ شخص بے ہوش ہو گیا، پھر بہت دیر بعد اس کو ہوش آیا تو وہ اپنے چہرے سے پسینہ پوچھ رہا تھا، اور اللہ سے خطاب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ اے اللہ! تیری نافرمانی کرنے والا ہلاک ہو جب تک کہ وہ آپ کے پاس گناہ کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہے، اس کا یہ خوف دیکھ کر بادشاہ بھی رونے لگا، مگر وہ شخص پیٹھ پھیرے ہوئے کھڑا رہا، یہاں تک کہ نکل گیا۔(الرقۃ والبکاء:۱۹۰)

ابن ابی الدنیا نے یہ بھی حیرت ناک واقعہ لکھا ہے کہ ابو عمر کہتے ہیں کہ میں وراد عجلی کو دیکھا کرتا تھا کہ وہ مسجد کو سر کو رومال سے ڈھک کر آتے اور ایک کونے میں کھڑے ہو کر مسلسل نماز پڑھتے، دعاء کرتے اور روتے رہتے، پھر مسجد سے نکلتے اور ظہر میں آتے اور اسی طرح نماز و دعاء اور بکاء میں لگے رہتے، یہاں تک کہ عشاء ہو جاتی، پھر مسجد سے نکلتے، نہ کسی سے بات چیت کرتے اور نہ کسی کے پاس بیٹھتے۔ابو عمر کہتے ہیں کہ میں نے ان کے محلّہ کے ایک آدمی سے ان کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کس کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟ یہ وراد عجلی ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا ہے کہ جب تک اللہ کو قیامت میں دیکھ نہیں لیں گے اس وقت تک نہیں ہنسوں گا۔(الرقۃ والبکاء:۱۹۲)

حضرت مالک بن ضیغم کہتے ہیں کہ مجھ سے حضرت حکم بن نوح نے میرے والد ابو مالک کے بارے میں کہا کہ ایک رات آپ کے والد اول سے آخر تک روتے ہی

رہے جس میں نہ کوئی سجدہ کیا نہ رکوع کیا، جب صبح ہوئی تو ہم نے کہا کہ اے ابو مالک! پوری رات میں آپ نے نہ نماز پڑھی نہ دعاء کی۔ تو وہ رونے لگے اور کہا کہ: اگر مخلوقات یہ جان لیں کہ کل وہ کس چیز کا سامنا کرنے والے ہیں تو کسی عیش کی چیز میں ان کو لذت نہ ملے، خدا کی قسم! میں نے جب رات کو، اس کی ہول ناکی اور اس کی تاریکی کی شدت دیکھی تو قیامت اور اس کی شدت و ہولنا کی یاد آگئی، جہاں ہر نفس اپنے آپ میں مشغول ہوگا، نہ کوئی باپ بیٹے کے کام آئے گا اور نہ بیٹا باپ کے کچھ کام آئیگا۔ یہ کہکر وہ بے ہوش ہو گئے اور مسلسل کانپتے رہے، پھر جب کچھ سکون ہوا تو ان کو اٹھا کر لے گئے۔ (الرقۃ والبکاء:۲۰۳)

اللہ والوں کے یہ واقعات بتا رہے ہیں کہ ان حضرات کو اللہ کا کس قدر خوف تھا اور آخرت کی کس قدر فکر تھی جس کی وجہ سے رات رات بھر وہ بے چین رہتے اور روتے اور گڑگڑایا کرتے تھے۔

حضرت رسالت مآب ﷺ کی ایک دعا:

حدیث میں حضرت رسالت مآب ﷺ کی دعاؤں میں یہ دعا بھی آئی ہے، آپ فرماتے ہیں:

"اَللّٰھُمَّ ارزُقنِی عَینَینِ ھَطَّالَتَینِ تَسقِیَانِ القَلبَ بِذُرُوفِ الدَّمعِ مِن خَشیَتِكَ قَبلَ اَن تَکُونَ الدُّمُوعُ دَمًا وَّالاَضرَاسُ جَمراً "(الحزب الاعظم)

(اے اللہ! مجھے دو ایسی آنکھیں عطاء فرما دیجئے جو بہت زیادہ برسنے والی (یعنی رونے والی) ہوں، جو آپ کے خوف سے آنسو بہا کر دل کو سیراب کر دیں، اس سے پہلے کہ آنسو (قیامت کے ہولناک منظر سے) خون بن جائیں اور

داڑھیں آگ بن جائیں)

اس عجیب دعاء میں نبی کریم ﷺ نے ایسی آنکھیں، اللہ سے مانگی ہیں کہ جو خوب رونے والی ہوں اور یہ رونا اللہ کے ڈر وخوف کی شدت سے ہو، اس کے ساتھ اس دعاء میں بعض حیرت انگیز اشارات بھی ہیں:

(۱) ایک تو یہ کہ اللہ کے ڈر سے رونے سے دل کو سیرابی نصیب ہوتی ہے، "تسقیان القلب" میں اس کی طرف اشارہ ہے، بعض روایات میں "تشفیان القلب" آیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ "دل کو شفاء دینے والی آنکھیں عطاء فرما"، یہ شفا سے ماخوذ ہے اگر اس روایت کو لیا جائے تو اس میں اشارہ ہے کہ اللہ کے ڈر سے رونا دل کی بیماریوں کے لیے شفاء ہے، اگر دل گناہ کا عادی ہے تو اللہ کے ڈر سے روکر تو دیکھو کہ اس میں کیسا جلا پیدا ہوتا ہے، پہلی روایت پر سیراب کرنے والی آنکھوں سے مراد یہ ہے کہ رونے سے دل اللہ کی عظمت اور خوف وخشیت سے لبریز ہوتا اور اس کے اثرات سے سیراب ہوتا ہے۔

(۲) دوسرا یہ کہ قیامت کی ہولناکی وخوفناکی ایسی ہوگی کہ آنکھ سے آنسوؤں کی جگہ خون نکلے گا؛ جیسے محاورہ میں بھی کہا جاتا ہے کہ خون کے آنسو روؤ گے" دنیا میں تو یہ مجاز ہے اور قیامت میں حقیقت، اس لئے آپ نے دعاء کی کہ اس دن کے آنے سے پہلے کہ رونا بھی چاہئیں تو آنسو نہ نکلے، ہم کو ایسی آنکھیں عطا فرمادے، جو خوب رونے والی ہوں، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ دنیا میں آدمی کو اللہ کے ڈر سے خوب رولینا چاہئے کہ بعد میں یہ موقعہ نہ ملے گا۔

(۳) تیسرے یہ کہ قیامت میں دوزخ کا عذاب ایسا سخت ہوگا کہ ڈاڑھ، دوزخ کی آگ میں جلکر خود آگ بن جائیں گے، آپ نے دعاء کی کہ اس واقعہ کے

آنے سے پیشتر رونے والی آنکھیں عطا فرمادے، تاکہ گناہ پر رورو کر یہیں گناہ صاف ہو جائیں۔ ہر مسلمان کو یہ دعا کرنا چاہئے اور اس کے مطابق رونا بھی چاہئے۔

انتظار کیجئے!!!

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب دامت برکاتہم (مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور) کے تحریر کردہ تقریباً چالیس—۴۰ فقہی مقالات و علمی مضامین کا بیش بہا علمی خزانہ جو چار جلدوں پر مشتمل خوبصورت انداز میں بنام ''**نفائس الفقہ**'' عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ جس کی ہر سطر مدلل ہونے کے ساتھ ساتھ مضامین عام فہم ہیں۔

باسمہٖ تعالیٰ

وصول الی اللہ کے لئے ترک دنیا ضروری نہیں

الحمد لله و كفى و سلام على عباده الذين اصطفى امابعد:
أعوذبالله من الشيطان الرجيم ـ بسم الله الرحمان الرحيم
﴿ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ﴾

یہ آیت کریمہ قرآن کریم کی ایک آیت کا ایک ٹکڑا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ''اللہ کے کچھ مخصوص بندے ایسے بھی ہیں، جن کو ان کی تجارت اوران کے دنیوی کاروبار اللہ کے ذکر سے، نماز سے، زکوۃ سے غافل نہیں کرتے'' حالانکہ وہ دنیا کا کام کرتے ہیں، دنیا کے معاملات کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود نہ ذکر سے غافل ہوتے ہیں، نہ نماز سے غافل ہوتے ہیں، نہ زکوٰۃ سے غافل ہوتے ہیں۔

اللہ کی یاد ان کے سینوں کے اندر ہر وقت ایسی موجزن ہوتی ہے جیسے کہ سمندر کا پانی موجزن ہوتا ہے، دنیوی کوئی کاروبار، دنیوی کوئی معاملہ ان کو اس سے غافل نہیں ہونے دیتا۔

مردوں کی دو قسمیں، ایک نکتہ:

یہ اولیاء اللہ کی صفت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان کیا ہے، یہ اللہ کے مخصوص بندے ہیں۔ یہاں پر قابل غور نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کہا ''رِجَالٌ''

رجال ''رجل'' کی جمع ہے، جس کے معنی ''مرد'' کے آتے ہیں، تو اللہ تعالی کی نظر میں مرد یہی ہیں، باقی سب نامرد ہیں۔

جیسے کہتے ہیں کہ دیو بند میں ایک دیوانی تھی اور وہ گلی کوچوں میں بالکل ننگی پھرا کرتی تھی، لیکن اگر کسی گلی میں چلتے چلتے اس کے راستہ میں حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ ایک طرف سے آجاتے تو فوراً پردہ کر لیتی اور کپڑا اپنے بدن پر ڈال لیتی اور کہتی کہ مرد آرہا ہے، مرد آرہا ہے۔گویا اس دیوانی کی نظر میں پورے دیو بند میں مرد ایک ہی تھے، باقی جتنے بھی تھے سب نامرد تھے، اس لیے ان سے تو پردہ کرتی تھی، باقی سب کے سامنے ننگی پھرا کرتی تھی۔

تو اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے مخصوص ومقرب بندوں کو ''رجال'' کہا ہے، یہ بتانے کے لئے کہ حقیقت میں یہی لوگ مرد ہیں جو ایسے مضبوط ہوتے ہیں کہ دنیا کے سارے کاروبار کرتے ہوئے بھی اپنے خدا سے کبھی غافل نہیں ہوتے، یہ اصلی مرد ہیں۔مرد بھی دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک اصلی مرد اور ایک نامی گرامی مرد، یعنی نام کے مرد، اللہ کی نظر میں اصلی مرد وہی ہیں جن کو دنیا کی کوئی طاقت، دنیا کا کوئی کاروبار اور بیوی، بچے دنیا کی اور چیزیں یہ سب کی سب مل کر بھی اللہ سے غافل ہونے نہیں دیتیں۔

اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے ہزاروں راستے ہیں:

اسی لیے حضرات صوفیاء کرام کہتے ہیں کہ اللہ تک پہنچنے کے لیے ایک ہی راستہ مقرر نہیں، بلکہ بزرگوں کا ارشاد ہے کہ تمام انسانوں کی جتنی سانسیں ہیں، خدا تک پہنچنے کے لیے اتنے ہی راستے اور طرق ہیں۔انسان کی سانسوں کی کیا تعداد ہے،

ایک دن میں ایک آدمی چوبیس ہزار مرتبہ سانس لیتا ہے، ہر آدمی چوبیس ہزار مرتبہ سانس لیتا ہے، اور دنیا میں کروڑوں انسان ہیں، کروڑوں انسانوں کی ہر روز کی سانسیں اور پھر ایک ایک انسان کی اتنی لمبی لمبی عمر، تو کتنا حساب بیٹھے گا؟ اس میں کوئی تعداد ہم بیان نہیں کر سکتے، بلکہ اس کا اندازہ بھی ہم صحیح طور پر نہیں کر سکتے۔ اس لیے دنیا کی کوئی چیز انسان کو خدا سے غافل کر ہی نہیں سکتی، بلکہ ہر چیز کے اندر سے اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔

اللہ تک پہنچنے کے لئے ایک تو وہ چیزیں مقرر ہیں اللہ کی طرف سے جو ضروری ہیں، جیسے نماز، زکوۃ، روزہ اور کچھ مخصوص چیزیں وہ اپنی جگہ پر ہیں، لیکن اس کے علاوہ ہر چیز میں انسان اللہ تعالیٰ کا راستہ پانے کے لیے سبیل تلاش کر سکتا ہے اور کوئی چیز اس کو غافل نہیں کرے گی، بلکہ اللہ تک پہنچا دیگی۔

تو اس لیے میں کہنا چاہتا ہوں کہ آپ حضرات مختلف کاروباری ہیں، مختلف مصروفیات کے ہیں۔ کوئی پڑھنے پڑھانے والا ہے، کوئی قرآن پڑھاتا ہے، کوئی حدیث پڑھاتا ہے، کوئی کچھ پڑھاتا ہے اور کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو تاجر پیشہ ہیں، کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو ملازمت پیشہ ہیں، مگر ہم سب کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ دنیا کا یا دین کا کوئی معاملہ ہم کو خدا سے غافل نہ کردے۔ دینی معاملہ کے غافل کرنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے، وہ تو غافل کرنے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ تک پہنچانے ہی کے لیے ہے۔

دینی خدام میں دو چیزوں کی کمی:

ایک اہم بات ہے، وہ یہ کہ مثلاً ایک آدمی قرآن پڑھاتا ہے، حدیث پڑھاتا ہے، فقہ کا درس دیتا ہے، یا اور کوئی دینی خدمت کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود

ہوسکتا ہے کہ اس کے ذریعہ وہ خدا تک نہ پہنچے۔

اور ایک آدمی کاروبار کرتا ہے، منڈی میں تجارت کرتا ہے، لیکن ہوسکتا ہے کہ منڈی کا وہ تاجر خدا تک پہنچ جائے۔ ایک آدمی قرآن پڑھا کر جہنم میں جاسکتا ہے اور ایک آدمی تاجر ہوکر جنت میں جاسکتا ہے، وہ کیسے؟

اس کی دو وجہ ہیں، ایک وجہ نیت کا فرق اور اخلاص کا فقدان اور ایک وجہ اپنی ذمہ داری کا احساس نہ ہونا۔ یہ دو وجوہات ہوتی ہیں عام طور پر جس کی وجہ سے نیک کام کرکے بھی ایک آدمی جہنم رسید ہوجاتا ہے، اور یہ دو باتیں آجکل عموماً دینی خدام میں پائی جاتی ہیں، اس لئے میں نے عرض کردیا کہ یہاں بھی ماشاءاللہ دینی خدام جمع ہیں، اور طالب اصلاح بھی ہیں، اگر یہ اصلاحی باتیں اب نہ کہی جائیں تو پھر ان مجالس کا کیا فائدہ؟

۞ نیت کا فتور اور مفتی محمد شفیع کا ارشاد:

نیت کا فرق وفتور کیا ہے؟ مثال کے طور پر ایک آدمی قرآن پڑھا رہا ہے، لیکن اس کی نیت یہ نہیں ہے کہ وہ اللہ کو پہچانے، اللہ کو پائے، بلکہ اپنے کسی دنیوی مفاد کے لیے پڑھا رہا ہے۔ یہ اخلاص کا فقدان ہے اور نیت کا فتور ہے۔

اسی لیے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ایک موقعہ پر دارالعلوم میں تقریر فرمائی تھی اور وہ تقریر حضرت کی چھپی ہوئی ہے۔ اس میں حضرت فرماتے ہیں کہ میں اپنی پوری زندگی کے مطالعہ کے بعد وہ تمام بزرگان دین جن کی خدمت میں اللہ نے مجھ کو پہنچایا، ان کی صحبتوں کو پانے کے بعد اور ان کے اقوال وارشادات اوران کے ملفوظات کی روشنی میں جو کچھ مجھے دین سمجھ میں آیا، اس دین کی روشنی میں

میں یہ کہتا ہوں کہ ’’اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو دین کے اس کام کے لیے قبول کیا ہے تو اس سے بہتر کوئی چیز نہیں، بشرطیکہ یہ اللہ کے لیے ہو، اور اس سے بدتر بھی کوئی مشغلہ نہیں ہے بشرطیکہ یہ دنیا کے لیے ہو۔

کیا خوب جملہ فرمایا، عجیب وغریب جملہ ہے، کہ دین کی خدمت سے بہتر بھی کوئی چیز نہیں ہے بشرطیکہ اللہ کے لیے ہو، اس سے بدتر بھی کوئی چیز نہیں ہے بشرطیکہ وہ دنیا کے لیے ہو جائے۔

موٹی سی مثال ہے کہ ایک عالی شان بہترین کپڑا ہے۔ فرض کیجئے کہ ریشم کا کپڑا ہے، اس ریشم کے کپڑے کو اگر کوئی شخص اپنے جوتوں کی دُھول پونچھنے کے لیے کام میں لایا کرے تو کیا کوئی آدمی یہ کہے گا کہ بڑا اچھا کام کیا ہے؟ سب اس کو کہیں گے کہ بے وقوف ہے، پاگل ہو گیا ہے۔ اسی طرح دین ریشم کے کپڑے کی طرح ہے، بلکہ اس سے بھی اعلیٰ درجہ کی چیز ہے۔ اگر کوئی اس کو دنیا کے لیے استعمال کر رہا ہے تو وہ بھی بے وقوف ہے۔ اس لیے کہ کوئی ریشم کے کپڑے کو جوتوں کی دھول پونچھنے میں استعمال نہیں کرسکتا، اسی طریقہ پر قرآن وحدیث کو پڑھانے کا سلسلہ دنیا کی کمائی کے لیے نہیں ہوسکتا۔

اس کے برخلاف اگر کوئی شخص کسی معمولی کپڑے کو استعمال کرے، کسی اچھی چیز کی دھول کو پونچھنے کے لیے تو کہیں گے کہ بھائی! شاباش، اچھی بات ہے۔ آپ کا کمپیوٹر رکھا ہوا تھا یا اور کوئی چیز رکھی ہوئی تھی، فریج رکھا ہوا تھا۔ آپ نے ایک معمولی سا کپڑا جو کسی کام کے قابل نہیں، اس غیر پسندیدہ کپڑے کو اٹھا کر اس کی دھول پونچھنے کے لیے استعمال کیا تو یہ کام ٹھیک کیا ہے۔

اسی طریقہ پر دنیا اللہ کی نظر میں ایک بے حیثیت چیز ہے، بے وقعت چیز ہے،

دنیا کو دین کے لیے استعمال کیا جائے تو بہت اچھی بات ہے، لیکن دین کو اگر دنیا کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو وہ بدترین چیز ہو جاتی ہے۔ اس لیے حضرت نے یہ جملہ فرمایا تھا۔ تو ایک وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ نیت ٹھیک نہیں آدمی کی۔

ذمہ داری کا احساس نہ ہونا:

اور دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ ذمہ داری کا احساس نہیں، جس کام پر لگا ہے، اس کا احساس نہیں ہے کہ مجھے کیا کام میں اللہ نے لگایا ہے، کیسے اعلیٰ کام میں لگایا ہے، اشرف ترین کام میں لگایا ہے، کیسے انتہائی مہذب، محترم کام میں اللہ نے لگایا ہے۔ جب اس کو مہذب، محترم، اشرف، مشرف، معظم سمجھے گا تو اس کے شایانِ شان خدمت بھی کرے گا۔ اگر اس کے شایان شان خدمت نہیں ہو رہی ہے تو یہ ہمارا ایسا قصور ہے جس کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ ہم کو اللہ تعالیٰ اس سے محروم کر دے۔

یہ دو وجہ ہوتی ہیں۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ دین کی خدمت کے ہونے کے باوجود ہو سکتا ہے کہ کوئی اللہ کو نہ پائے، اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا کا کاروبار کرنے والا اس کے ذریعہ اللہ کو پالے۔

تاجر ولی بن سکتا ہے، شیخ منکدر کا واقعہ:

حضرت امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں ایک قصہ لکھا ہے کہ بغداد کے علاقہ میں ایک شخص رہتے تھے، جن کا نام تھا شیخ منکدر، اور ان کی ایک دکان تھی، تجارت پیشہ آدمی تھے، انہوں نے اپنے خادموں سے ایک دفعہ کہہ دیا کہ بھائی دیکھو! یہ کپڑا اتنے کا ہے، اور وہ کپڑا اتنے کا ہے، یہ لبادہ اتنے کا ہے، فلاں لبادہ اتنے کا ہے۔ اس سے زیادہ قیمت میں فروخت نہ کرنا۔ اور ایک کپڑے کے بارے میں بتایا کہ یہ دو دینار کا

ہے، اور ایک کے بارے میں کہا کہ یہ تین دینار کا ہے، اس طرح تاکید کردی۔

ایک مرتبہ اپنے کسی کام سے جا رہے تھے، راستہ میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی جو اعرابی و دیہاتی تھا، دیکھا تو اس کے پاس ایک لبادہ ہے، انہوں نے پوچھا کہ بھائی! یہ لبادہ کہاں سے خریدا؟ تو اس نے کہا کہ ادھر ایک دکان ہے وہاں سے خریدا ہے۔ پھر پوچھا کہ کتنے میں خریدا؟ تو اس نے کہا کہ میں نے تین دینار میں خریدا ہے۔

تو انہوں نے اسے لے کر الٹ پلٹ کر کے دیکھا اور اس کے بعد میں کہا کہ یہ تو دو دینار کا ہے، تم نے تین دے دیئے، ایک دینار تم نے زائد دیدیا ہے، اس لیے چلو اس کو واپس کر دو، یا تو اپنی قیمت واپس لے لو یا نہیں تو اپنا ایک دینار واپس لے لو۔

تو اس نے کہا کہ آپ کون ہے؟ انہوں نے کہا کہ میں اسی دکان کا مالک ہوں، تو شیخ منکدر اس دیہاتی کو لے کر واپس پہنچے اور اپنے خادم سے کہا کہ تم نے یہ غلط حرکت کیوں کی؟ اس کا ایک دینار واپس کرو یا نہیں تو اسے تین دینار والا لبادہ دے دو۔ خادم نے اس شخص سے پوچھا کہ کیا چاہتے ہیں؟ اس دیہاتی نے کہا کہ ایک دینار واپس کردو۔ چنانچہ ایک دینار واپس کر دیا گیا اور وہ دیہاتی واپس جانے لگا، چلتے چلتے کچھ آس پاس کے لوگوں سے پوچھا کہ بھائی یہ کون صاحب ہیں، بڑے امانت دار معلوم ہوتے ہیں کہ ایسا ایسا واقعہ میرے ساتھ پیش آیا ہے۔ تو لوگوں نے کہا کہ آپ نہیں جانتے ان کو؟ یہ شیخ منکدر رہیں۔

تو اب اس دیہاتی نے کہا کہ اچھا یہ ہیں شیخ منکدر، ہم لوگ اپنے علاقہ میں جب کبھی بارش بند ہو جاتی ہے تو شیخ منکدر کا واسطہ دے کر دعائیں مانگا کرتے ہیں، اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہم کو بارش دے دیتا ہے، اس نے کہا یہ تو وہ آدمی

ہیں، مجھے پتہ نہیں تھا اور کہنے لگا کہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ شیخ منکدر کوئی صاحب جبہ ودستار شخصیت ہوگی، جو کسی خانقاہ میں بیٹھ کر تسبیح گھماتے ہوں گے،لیکن یہاں آ کر پتہ چلا کہ یہ تو تاجر آدمی ہیں، تجارت کر رہے ہیں،لیکن مقام ایسا ہے اللہ کے نزدیک کہ اللہ ان کے نام کی بدولت، ان کے واسطے کی وجہ سے بارشیں نازل کر رہا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر راستے سے خدا کو پایا جا سکتا ہے۔

بادشاہ بھی ولی اللہ ہوسکتا ہے،حضرت شجاع کرمانی کا واقعہ:

مثال کے طور پر کرمان کے بادشاہ حضرت شجاع کرمانی دیکھئے، یہ کرمان ایک بستی ہے، حضرت شجاع اس بستی کے بادشاہ تھے،اور ساتھ ہی بہت بڑے اللہ کے ولی تھے،ان کا ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ وہ مسجد تشریف لائے،نماز پڑھنے کے بعد دیکھا کہ ایک طالب علم نماز پڑھ رہے ہیں، بڑے خشوع کے ساتھ، بڑے اطمینان کے ساتھ،اور ایسی اچھی نماز کہ انہوں نے خال خال ہی کسی کو ایسا نماز پڑھتے دیکھا تھا۔

تو ان کا دل اندر سے کہنے لگا کہ یہ طالب علم جو نماز پڑھ رہا ہے،اتنی شاندار نماز، یہ اس قابل ہے کہ میں اس کو اپنا داماد بنالوں،انہوں نے مال نہیں دیکھا،انہوں اس کی دنیوی حیثیت نہیں دیکھی، اس کا حسب ونسب نہیں دیکھا،اس لیے کہ ان چیزوں سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے،تو شیخ کرمانی کے دل میں آیا کہ کیوں نہ میں اسکو اپنا داماد بنالوں، وہ طالب علم نماز سے فارغ ہوا،تو انہوں نے اپنے وزیر سے کہا کہ اس طالب علم کو بلا کر لاؤ،وزیر نے جا کر اس کو بلایا،وزیر کے بلانے پر وہ بیچارہ کانپ

گیا کہ بادشاہ بلا رہے ہیں، پتہ نہیں کیا بات ہے؟ اب وہ آیا ڈرتے ہوئے، کانپتے ہوئے کہ معلوم نہیں میرے سے کیا خطا ہوگئی، لغزش ہوگئی ہوگی یا معلوم نہیں کہ کیا سوال کرلیا جائے اور میں جواب دے سکوں کہ نہ دے سکوں؟ جب وہ حاضر ہوا تو بادشاہ نے اسے بٹھایا اور بٹھانے کے بعد کہا کہ میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ میرے دل میں یہ خواہش گزری کہ میں تم کو اپنا داماد بنالوں، تمہاری اگر شادی نہیں ہوئی ہے تو تم اگر شادی کرنا چاہو تو میری لڑکی سے شادی کرلو، بس جناب یہ سننا تھا کہ ان کا دماغ چکرانے لگا، اس لیے کہ باشادہ کی بیٹی کو یہ فقیر شادی کرکے کیا کرے گا؟ کہاں رکھے گا؟ کیا کھلائے گا؟ کیسے اس کی خواہشات پوری کرے گا؟ اسے ہوسکتا ہے کہ دن میں پچاس جوڑوں کی ضرورت ہو، اب بے چارہ چکر میں آگیا، ہاں کہوں تو مشکل، نہ کہوں تو بھی مشکل، ہاں کہنے میں یہ مصیبت، نہ کہنے میں یہ کہ بادشاہ کہیں ناراض ہوجائے کہ میری طرف سے یہ پیغام دیا جارہا ہے اور تو ٹھکرا رہا ہے۔

بالآخر اس نے قبول کرلیا، اس کے بعد شادی کا وقت آیا، شادی ہوگئی، شادی ہونے کے بعد رخصتی ہوئی، یہ اپنے جھونپڑے میں لے گیا شہزادی کو، اور کھانے پینے کا مختصر انتظام ایک دو وقت کے لیے اس نے بنا رکھا تھا، جب کھانے کا وقت آیا تو میاں بیوی کھانے کے لیے بیٹھے، شرما شرمی میں کچھ زیادہ نہیں کھایا گیا، اور کچھ کھانا بچ گیا، اس طالب علم نے اپنی بیوی سے جو کہ شہزادی تھی کہا کہ اس بچے ہوئے کھانے کو کو اُٹھا کر رکھ دینا، صبح ہمیں ناشتے میں کام آئے گا، اس نے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور رونے بیٹھ گئی، اب رو رہی ہے، رو رہی ہے، طالب علم بہت پریشان کہ آخر کیا ماجرا ہے؟ اس نے اس سے بار بار پوچھا کہ کیا بات ہے؟ کیوں

روتی ہو مگر اس نے کوئی جواب ہی نہیں دیا، یہ کہنے لگا کہ میں نے تمہارے والد سے پہلے ہی کہا تھا کہ میں آپ کی بیٹی کو کیسے سنبھالوں گا، میری جھونپڑی اسے کیسے پسند آئے گی، میری رہائش کا انداز اسے کیسے پسند آئے گا، میرا سوکھا موکھا کھانا اسے کیسے پسند آئے گا، لیکن آپ کے والد نے بڑی غلطی کی کہ میرے سے آپ کی شادی کردی اور آپ کے تمام جذبات اور تمام خواہشات کو انہوں نے بالکل پیس کر رکھ دیا، یہ آپ کے والد کی غلطی ہے، میری غلطی نہیں ہے، شاید تم کو میرا یہ جھونپڑا اور یہ سوکھا کھانا پسند نہیں آیا، اس لئے رو رہی ہو؟ شہزادی نے کہا کہ میں اس لیے نہیں رو رہی ہوں کہ مجھے جھونپڑے میں رکھا گیا یا سوکھا کھانا کھلایا گیا، بلکہ اس لیے رو رہی ہوں کہ میرے والد نے مجھے یہ کہا تھا کہ میں ایک متقی پرہیز گار اور اللہ والے سے تیرا رشتہ کر رہا ہوں، جو توکل علی اللہ کی دولت سے مالا مال ہے، لیکن میں نے یہاں پر آ کر آپ میں توکل نہیں دیکھا، آپ کہہ رہے ہیں کہ
کھانا اٹھا کر کل کے لیے رکھو، جس خدا نے آج آپ کو دیا وہ کیا کل نہیں دے سکتا؟ اس لیے مجھے رونا آ رہا ہے۔

اللہ اکبر! آپ سوچئے کہ وہ بادشاہ کیسا ہوگا اور بادشاہ کی بیٹی پر اس کی تربیت کیسی ہوگی، اس کا اندازہ کچھ دیر کے لیے آپ کرنا چاہیں، میں سمجھتا ہوں کہ صحیح طور پر نہیں کر پائیں گے، بادشاہ کا جو انداز ہوتا ہے، اس کے پاس جو طاقتیں ہوتی ہیں، جو چیزیں ہوتی ہیں، اس کے اندر دینی غیرت ایسی، توکل ایسا، اللہ سے تعلق ایسا پیدا کرنے کی اس نے اگر کوشش کی ہے تو کیا کیا نہ کیا ہوگا؟

معلوم ہوا کہ ایک آدمی بادشاہ ہوتے ہوئے خدا کا ولی ہو سکتا ہے، شہزادی خدا کی ولی ہو سکتی ہے، شہزادہ خدا کا ولی ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ تک پہنچنے کے لیے

ہزار راستے ہیں، کروڑوں ہیں، جس راستے سے چاہے آدمی پہنچ سکتا ہے، کوئی چیز اسے اللہ تک پہنچنے سے روک نہیں سکتی، جیسا کہ آپ کو یہ مثالیں بتا رہی ہیں۔

سب کچھ کریں، مگر دل اللہ سے غافل نہ ہو:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ اللہ کے نبی علیہ الصلوۃ والسلام گھر میں اس طرح رہتے تھے کہ کوئی دور سے دیکھنے والا یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ آپ اتنے بڑے جلیل الشان خدا کے نبی ہیں، بالکل معمولی سا انداز ہوتا تھا، آپ گھر کا کام بھی کر رہے ہیں، کبھی جھاڑو بھی دے رہے ہیں، کبھی چولہا بھی پھونک رہے ہیں اور مختلف کاموں میں لگے ہوئے ہیں، بیویوں کے ساتھ ہنستے بولتے بھی ہیں، مزاح وتفریح بھی ہو رہی ہے، اپنے گھر کے اور افراد کے ساتھ بھی بات چیت ہو رہی ہے، اس کے بعد کہتی ہیں لیکن جونہی اذان ہو جاتی تو آپ کے چہرۂ انور کا رنگ بدل جاتا، اذان ہوتے ہی ایسا معلوم ہوتا کہ آپ ہم کو پہچانتے ہی نہیں ہیں۔ (خلاصہ از بخاری:۵۶۹۲ ، ترمذی:۲۴۸۹، مسند احمد: ۲۵۷۵۱، صحیح ابن حبان:۱۲/۴۹۰)

اس طرح ہمیں بھی زندگی کرنا چاہئے کہ دنوی کاروبار کے وقت اس کو کیا جائے مگر خدا سے غافل نہ ہوں، نماز سے قرآن سے، ذکر وتلاوت سے کسی سے غافل نہ ہونا چاہئے۔

اسی کو بزرگوں نے کہا اور نقشبندیہ سلسلہ کے بزرگوں میں ایک اصطلاح ہے، ''خلوت در انجمن'' لوگوں کے درمیان میں انجمن میں بیٹھے ہیں، مجلس میں بیٹھے ہیں، لیکن تب بھی خلوت میں ہیں، لوگوں سے بات چیت ہو رہی ہے، دل اللہ کی طرف لگا ہے، لوگوں سے میل ملاپ ہو رہا ہے، لیکن دل کا تعلق اللہ سے قائم ہو گیا ہے۔

اس کو کہا قرآن نے کہا:﴿ رِجَالٌ لَّا تُلۡهِيۡهِمۡ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيۡعٌ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيۡتَآءِ الزَّكٰوةِ ﴾

ایک دربان کا مقام ولایت، عبداللہ حاجب کا واقعہ:

اسی طرح ایک واقعہ کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک آدمی جنگل سے گزر کر شہر کی طرف آرہا تھا تو ایک بوڑھے سے ملاقات ہوئی، تو ان بوڑھے صاحب نے اس سے پوچھا کہ آپ کہاں جارہے ہیں؟ تو کہا کہ میں شہر کی طرف جارہا ہوں، تو کہا کہ اچھا دیکھو اگر فلاں محلّہ میں آپ کا جانا ہو تو عبداللہ نام کے ایک صاحب فلاں جگہ پر رہتے ہیں، ان کو عبداللہ حاجب کہتے ہیں، وہ ایک رئیس کے دربان ہیں، ان سے میرا سلام سنا دینا۔

جب یہ صاحب اس محلّہ میں آئے تو ان کو یاد آیا تو انہوں نے تلاش کیا کہ یہاں عبداللہ حاجب کون ہیں؟ تو لوگوں نے بتایا کہ فلاں جگہ پر رہتے ہیں، اور ایک امیر کے دربان ہیں، دربان کیا؟ گیٹ کیپر، کوئی بڑا عہدہ نہیں ہے۔

اب وہاں پہنچے اور ان کو جا کر کہا کہ میں فلاں جگہ سے فلاں دن آرہا تھا، راستہ میں ایک بزرگ شخصیت سے ملاقات ہوئی، انہوں نے آپ کو سلام بھیجا ہے، عبداللہ حاجب نے وعلیک وعلیہ السلام کہا۔ اس کے بعد اس آدمی نے پوچھا کہ وہ بزرگ کون تھے جو آپ کو سلام سنا رہے تھے، تو عبداللہ حاجب نے کہا کہ آپ کو اس سے کیا غرض ہے؟، مگر وہ آدمی اصرار کرتا رہا کہ بتا دیجئے! کیونکہ ان کا چہرہ بہت نورانی تھا، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی بہت بڑی شخصیت ہے۔

تو انہوں نے کہا کہ وہ اصل میں حضرت خضر علیہ السلام تھے۔ اس آدمی کے دل میں آیا کہ حضرت خضر علیہ السلام خصوصیت کے ساتھ اس آدمی کو سلام کیوں بھیج رہے

ہیں، جب کہ اس شہر میں اتنے لوگ ہیں، مسجدوں کے امام بھی ہوں گے، اور مدارس کے معلمین و مدرسین بھی ہوں گے، بڑی بڑی خانقاہوں کے شیوخ بھی ہوں گے، علماء ومفتیان بھی ہونگے، لیکن ان سب کو چھوڑ کر حضرت خضر علیہ السلام اس کو کیوں سلام پہنچا رہے ہیں، وہ بھی ایک دربان کو، کیا بات ہے؟ تو اس نے پوچھا کہ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آخر حضرت خضر علیہ السلام آپ کو خصوصیت کے ساتھ سلام کیوں سنائے ہیں؟ تو وہ صاحب کہنے لگے کہ بس ہمارا اور ان کا ایک تعلق ہے، اس لئے انہوں نے سلام کہا ہے۔

اس آدمی نے کہا کہ کیا آپ کوئی مخصوص عمل کرتے ہیں؟ تو عبداللہ حاجب نے کہا کہ کسی بھی کام میں لگتا ہوں تو میرا دل خدا سے غافل نہیں ہوتا، پھر انہوں نے اپنی تفصیل سنائی کہ صبح اٹھتا ہوں، اس کے بعد یہ کرتا ہوں، اس کے بعد یہ کرتا ہوں، اس کے بعد امیر کے پاس جاتا ہوں، اس کی یہ خدمت کرتا ہوں، اور یوں رہتا ہوں، لیکن جو کچھ بھی کرتا ہوں، لیکن خدا سے کبھی دل غافل نہیں ہوتا ہے۔

یہ ہے وہ بات جس کو قرآن کہتا ہے " رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰه" ایسے مرد ہیں، عجیب وغریب مرد کہ سب کچھ کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود تجارت اور خرید وفروخت ان کو اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی، ایسے بندوں کے لیے اللہ کے نزدیک خصوصیت کا مقام ہے، تو اس لیے ہمیں کسی بھی راستے کو یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس کے ذریعہ ہم اللہ کے راستہ میں چلنے سے فیل ہوجائیں گے۔ تاجر اپنی تجارت کے ذریعہ اللہ کو پاسکتا ہے، ملازم اپنی ملازمت کے ذریعہ اللہ کو پاسکتا ہے۔ دو واقعات میں نے آپ کو سنائے، پہلے واقعہ میں تاجر کا قصہ آیا ہے، دوسرے واقعہ میں ملازم کا قصہ آیا۔

معلوم ہوا کہ کوئی شخص ملازمت کرتے ہوئے بھی خدا تک پہنچ سکتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی تاجر تجارت کرتے ہوئے اللہ کو پالے، یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ آپ دنیا کے کاروبار کو چھوڑیں، تبھی آپ اللہ تک پہنچ سکتے ہیں، یہ بات بالکل غلط ہے، اور ذہن میں اس طرح کی بات لانے سے ہوسکتا ہے کہ شیطان کسی اور راہ پر ڈال دے۔ کسی بھی راستہ پر اللہ نے آپ کو لگایا ہو، جائز طریقہ ہو، اس کے ذریعہ آپ اللہ کو پاسکتے ہیں۔

یادِ حق اور کاروبار کا اجتماع ممکن، ایک واقعہ:

فرمایا کہ ہاں یہ سوال یہاں پیدا ہوتا ہے کہ ہم کاروبار میں، ملازمت میں اور دنیوی کاموں میں رہتے ہوئے بھی کس طرح اللہ کو یاد رکھ سکتے ہیں؟ اکثر لوگ ان دو باتوں میں تضاد سمجھتے ہیں، مگر ان میں کوئی تضاد نہیں، میں اپنا ایک واقعہ سناتا ہوں، اس سے اس پر روشنی پڑتی ہے، وہ یہ کہ ہمارے بچپن کا واقعہ ہے کہ میسور میں جو مہاراجہ گزرا ہے اس کا محل اب تک موجود ہے، مشہور ہے، اور بڑا عالیشان ہے، واقعی بہت شاندا ہے، شاید پرانے محلات میں سے یہی ایک محل ایسا باقی رہ گیا ہے، جو شروع سے اخیر تک محفوظ ہے، ورنہ تو سب کھنڈروں میں تبدیل ہو چکے ہیں، بہت زمانہ پہلے بچپن میں ایک بار ہم لوگ وہاں گئے، میرے ساتھ اور بھی کچھ لوگ تھے، تو وہاں یہ بتایا گیا کہ اتوار کو یا ہفتہ کے دن پورے محل کے لائٹ جو اس کے اوپر ڈیکوریشن کے طور پر لگائے گئے ہیں، پورے کے پورے ایک ہی وقت میں جلائے جاتے ہیں، اور اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورے محل کو ایک دم آگ لگ گئی، ایک دم ایک ہی سکنڈ میں پورا محل روشن ہوجاتا ہے، ہزاروں ہزار لائٹس اس کے پورے محل کے اوپر لگائے ہوئے ہیں، اور سب کے سب ایک دم سے جلائے جاتے ہیں۔ اس کو دیکھنے کے لیے ہزاروں لوگ آکر بیٹھے ہوئے تھے، تو ہم لوگ بھی چلے

گئے، اور ایک طرف کو بیٹھ گئے، تو جو حضرات ہمارے ساتھ تھے وہ کچھ کھانے کے لیے بھی لائے، اور ہم لوگ کھا بھی رہے تھے، اور کچھ باتیں بھی کر رہے تھے، لیکن اس کے باوجود دل دماغ اُدھر ہی لگا ہوا تھا، کہ وہ لائٹ اب جلیں گے، تب جلیں گے، اس لیے کہ وہ لمحہ ایک ہی لمحہ آتا ہے، اور وہ لمحہ ہی میں دیکھنے کا ہوتا ہے، جلنے کے بعد تو سبھی دیکھتے رہتے ہیں، وہ دیکھنے کا نہیں ہے، دیکھنا یہ ہے کہ جلتے وقت کیسا جلتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا کہ یہ پورا محل آگ ہی ہے، اسی وقت اسی سکنڈ میں دیکھنا ہے، یہ سکنڈ گزر گیا تو پھر ایک ہفتہ کے بعد میں وہ سکنڈ آئے گا، اس لئے کھاتے پیتے، کام کاج کرتے، بات چیت کرتے ہوئے بھی دماغ ادھر ہی لگا تھا۔

اس سے ایک بات کی جانب ذہن منتقل ہو گیا اور یہ بات معلوم ہوئی کہ جو بزرگان دین کہتے ہیں کہ دنیا کا کام کرتے ہوئے بھی اللہ کی طرف توجہ ہو سکتی ہے، وہ دراصل ایسے ہی ہے کہ کھانے پینے میں باتوں میں مصروف ہونے کے باجود دماغ ادھر ہوا لگا ہوا ہو۔

بھائیو! اسی طریقہ پر اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اللہ کی طرف توجہ ایک آدمی کے دل میں اگر رسوخ پکڑ جائے تو دنیا کا کوئی کاروبار اور دنیا کی کوئی چیز اسے غافل نہیں کر سکتی۔

یہ مضمون ہے اس کو آپ ذہن میں لے جایئے اور اپنے کاروبار کرتے ہوئے، اپنی ملازمت کرتے ہوئے، اپنی تعلیم کرتے ہوئے، اور دنیا میں مختلف اپنے کام وکاج میں لگتے ہوئے، بیوی بچوں میں رہتے ہوئے، گھریلو کام کرتے ہوئے، کسی بھی چیز میں یہ نہ سوچئے کہ یہ اللہ سے ہم کو غافل کرنے والی ہے، بلکہ یہ سب چیزیں ہمارے لیے اللہ کے کام میں معین اور مددگار ہو سکتی ہیں، اس کے ذریعہ اپنے آپ کو خدا تک پہنچانے کی کوشش کریں، اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی توفیق عطا فرمائے۔

تمت

اُنهیں کا کرم دیکھتے هیں

از: محمد شعیب اللہ خان ظرؔفی

زمانے کو زیرِ قدم دیکھتے ہیں ☆ یہ سب ہم اُنہیں کا کرم دیکھتے ہیں
غلاموں کو شاہی کی عزت ملی ہے ☆ غلامی کا صدقہ یہ ہم دیکھتے ہیں
کبھی کیف و مستی کبھی قبض و وحشت ☆ سبھی میں رُموز و حِکَم دیکھتے ہیں
مَرَض ہو یا صحّت، الم ہو یا راحت ☆ مشیت پہ سب ہی کو خم دیکھتے ہیں
مقامِ ولایت جنہیں مل گیا ہو ☆ نہ خائف وہ ہوتے نہ غم دیکھتے ہیں
ترے عشق کا غم جنہیں مل گیا ہو ☆ دلوں میں وہ لطفِ حَرَم دیکھتے ہیں
ترے نام کی لذّتیں پا گئے جو ☆ تجلی تری دمبدم دیکھتے ہیں
شعیبؔ اُن سے اُن کے سوا ہم کیا مانگیں
کہ ہر شئ کو ہم کالعدَم دیکھتے ہیں